سعودی عرب کی قلم کار
خواتین کی منتخب کہانیاں
Voices of Change
Short Stories by
Saudi Arabian Women Writers
مترجم
عذرانقوی

کتاب کا نام	:	سعودی عرب کی قلم کار خواتین کی منتخب کہانیاں
مترجم کا نام	:	عذرا نقوی
اشاعت اوّل	:	2008
تعداد	:	200
قیمت	:	-/175 روپے۔ 20 سعودی ریال
مطبع	:	مسلم ایجوکیشنل پریس، بنی اسرائیلان، علی گڑھ۔ انڈیا

موبائل: 09897165496

ملنے کا پتہ

ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ۔

مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ۔

فرحت کدہ، سرسید نگر، علی گڑھ

انتساب

اپنے شریکِ حیات
ڈاکٹر پرویز احمد کے نام
جو ہمیشہ میرے
ادبی شوق کی
رہنمائی اور سرپرستی کرتے ہیں۔

Kingdom of Saudi Arabia
Ministry of Culture and Information
Office of the deputy Minister for international Culture Relations

المملكة العربية السعودية
وزارة الثقافة والإعلام
مكتب وكيل الوزارة للعلاقات الثقافية الدولية

Ref No.: ---------- الرقم: ----------
Date : ---------- التاريخ: ----------
Encl : ---------- المرفقات: ----------

السيدة / عذراء نقوي **سلمها الله**

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته.. وبعد :

سعدت كثيراً بالإطلاع على ترجمتك للكتاب الصادر بالإنجليزية بعنوان" أصوات التغير" والذي يتناول القصة القصيرة السعودية التي تتناول المراءة ، والذي ترجم بعنوان: " سعودي عرب كي قلم كار خواتين كي منتخب كها نيال ". واعتقد أنه بعملك هذا قد قمت بعمل ثقافي يستحق الإشادة والمباركة ، وتكمن أهمية هذه الترجمة في أنها تشكل نظرة أدبية إبداعية تعرف بالأدب السعودي الحديث والمعاصر لأصدقاء تاريخيين عرفوا العالم العربي وتخصيصاً الجزيرة العربية لقرون طويلة لكن مع ذلك ورغم عمق العلاقات التاريخية والاقتصادية والسياسية ، ربما جهل الجمهور العريض والمثقفون عن أدب وثقافة لآخر بهذه الترجمة فتحت أفاقاً جديدة ومن ثم آمال عريضة لمزيد من التواصل والتعارف للواقع الفكري والإبداعي المعيش اليوم.

أهنك على جهدك وأتمنى لكي مزيد التوفيق والنجاح في تعميق التواصل ومن ثم التفاهم الثقافي فيما بيننا ، داعياً المولى أن يتوج جهودك دائماً بالنجاح ودمتم.

صديقك

أ.د. أبو بكر بن أحمد باقادر

وكيل الوزارة للعلاقات الثقافية الدولية

١٤٢٠/١٢/٢١

المملكة العربية السعودية - ص.ب ٦٧٠ الرياض ١١١٦١ - هاتف : ٤٦٣١٩٦٥ - فاكس : ٤٦٦٤٧٠٢
Kingdom of Saudi Arabia - P.O. Box 670 Riyadh 11160 - Tel. : 4631965 - Fax :4664702

فہرست

پہلا حصّہ

دوسرا حصّہ

تیسرا حصّہ

چوتھا حصّہ

تعارف

سعودی عرب اور خاص کر سعودی عرب کی خواتین کے بارے میں مغربی ذرائع ابلاغ کا جورویہ ہے وہ سب بخوبی جانتے ہیں۔لیکن برصغیر میں بھی اس بارے میں کافی حد تک stereotyping ہی ہے۔میں نے پچھلے بارہ تیرہ سال سعودی عرب کے شہر ریاض میں گذارے ہیں۔یہ بات ضرور ہے کہ سعودی عرب کے مقامی لوگ، یہاں آکر برسوں رہنے والے تارکین وطن سے زیادہ سماجی روابط نہیں رکھتے ہیں۔برسہا برس یہاں رہنے کے بعد بھی انھیں یہاں کی تہذیب اور رہن سہن کا پورا ادراک نہیں ہوتا ہے۔میرا کیونکہ یہاں صحافت سے تعلق رہا اور کچھ میرے شوہر کا یونیورسٹی سے تعلق ہونے کی وجہ سے مجھے سعودی خواتین کے بارے میں کسی حد تک جاننے کا موقع ملا۔

یہ کتاب Voices of change مجھے سعودی عرب کے انگریزی روز نامہ ''سعودی گزٹ'' کے معاون مدیر ڈاکٹر عبدالعزیز السبیل نے دی تھی جو کنگ سعود یونیورسٹی، ریاض میں عربی ادب کے پروفیسر بھی ہیں اور اب وزارتِ ثقافت میں منسٹر ہیں۔ میں ان کی بہت شکر گذار ہوں۔اس کتاب کی ترتیب اور عربی سے انگریزی ترجمے میں ڈاکٹر سبیل کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔میں جناب طارق غازی صاحب کی بہت شکر گذار ہوں جنھوں نے اپنی اہم علمی مصروفیات میں سے وقت نکال کر اس کتاب کا پیش لفظ لکھا۔طارق غازی صاحب ادیب اور صحافی ہیں انھوں

نے تقریباً تیس برس جدہ میں گذارے ہیں۔ وہ انگریزی روزنامے سعودی گزٹ کے معاون مدیرہ چکے ہیں۔

میں نے سوچا کہ ان کہانیوں کا اردو ترجمہ کروں تا کہ اردو قارئین کو معاصر سعودی تانیثی ادب کا کچھ اندازہ ہو۔ اس مجموعے میں جو کہانیاں ہیں ان کے تین ماخذ ہیں۔ زیادہ تر پہلے سعودی اخباروں میں شائع ہوئی تھیں جیسے ''عکاظ'' ''البلاد'' اور ''المدینہ''۔ کچھ رسائل میں چھپی تھیں جیسے ''سیدتی'' اور ''حوا'' اور کچھ کہانیاں مصر اور لبنان میں شائع ہونے والے منتخب کہانیوں کے مجموعوں سے لی گئی ہیں۔ یہ سب کہانیاں عربی میں لکھی گئی تھیں پھر ان کا ترجمہ انگریزی میں ہوا تھا۔ کیونکہ یہ کہانیاں مجھ تک بہ زبانِ انگریزی پہنچیں اس لئے ترجمے کا پورا حق تو ادا نہیں ہو سکے گا۔ لیکن اسلامی قوانین اور سماجی اور ثقافتی اقدار سے واقفیت اور عربی زبان کی کچھ شدبدٗ ہونے کی وجہ سے ترجمے میں کچھ آسانی ضرور ہوئی۔ میں ریاض میں انگریزی اور اردو اخباروں میں آزاد صحافی کے طور پر کام کرتی ہوں۔ شاعرہ اور افسانہ نگار بھی ہوں۔ میرے افسانوں کا ایک مجموعہ ''آنگن جب پردیس ہوا'' شائع ہو چکا ہے۔

اس مجموعے میں شامل کہانیاں عرب خواتین کی موجودہ زندگی اور مسائل کو سامنے لاتی ہیں اور ان سے عرب خواتین کے فکشن کے مخصوص اسلوب کو بھی سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اسلوب جو ان کے موجودہ معاشرے کا عکاس بھی ہے اور پابند بھی ہے۔ ان میں سے بعض کہانیاں اردو قاری کو مانوس لگیں گی اور کچھ حیران کر دیں گی۔ ان میں سے زیادہ تر کہانیاں احتجاجی لہجہ رکھتی ہیں۔ قاری کے لئے ایک چیلنج ہے کہ وہ طے کرے کہ کس بات پر احتجاج کیا جا رہا ہے اور کس چیز کو روایت کے طور پر قبول کیا گیا ہے۔

انیس سو ساٹھ اور ستر کی دھائیوں تک بس چند ہی سعودی خواتین لکھتی تھیں اور

ان کی چیزیں کم ہی منظر عام پر آتی تھیں ۔اس میدان میں مردوں ہی کا اجارہ تھا۔ان میں سے کچھ خواتین جیسے سمیرہ خاشقجی اور نجاۃ خیاط کا تعلق ان خاندانوں سے تھا جو اپنی بیٹیوں کو تعلیم کے لئے باہر بھیج سکتے تھے۔ان خواتین کا اپنی تحریروں میں ایک متعین سماجی ایجنڈا تھا۔انیس سوستر تک آتے آتے لکھنے والیوں میں صرف اعلیٰ خاندانوں ہی کی خواتین نظر نہیں آتیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ انیس سو ساٹھ کی دہائی میں لڑکیوں کی تعلیم کی تحریک نے جنم لیا تھا۔شاہ فیصل کی بیگم نے لڑکیوں کا پہلا اسکول شروع کیا تھا۔انیس سو ستر میں تیل نکلنے کے بعد مملکت میں اشاعتی ادارے کھل گئے ۔انیس سو اسی اور انیس سو نوے کی دہائیاں سعودی عرب میں ادبی احیاً کا زمانہ ہے۔اور اسی عرصے میں تانیثی ادب بھی ابھرا، اور اس حد تک چھایا کہ اگر اس زمانے کے اخبارات اور رسائل کا جائزہ لیں تو خواتین کے نام زیادہ نظر آئیں گے۔عورتوں کو مختلف ادبی کلبوں میں ممبر بننے کی اجازت مل گئی جہاں ان کی تخلیقات کا تنقیدی تجزیہ کیا جاتا تھا۔پچھلی دہائی میں انٹرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا کے زیر اثر معاشرے میں تبدیلیاں کافی تیزی سے رونما ہوئی ہیں۔ابھی حال ہی میں ریاض کی ایک نوعمر سعودی لڑکی کا لکھا ہوا ناول ''بنات الریاض'' کافی مشہور ہوا ہے۔ Girls of Riyadh کے نام سے اس کا انگریزی ترجمہ بھی ہوا ہے۔اس ناول کو مغرب میں بہت ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔سعودی عرب میں اس ناول پر پابندی عائد تھی۔

Voices of Change نامی اس کتاب میں شامل کہانیاں چار حصوں پر مشتمل ہیں۔آپ بیتیاں، سماجی مسائل، رومان اور یادداشتیں۔ان کہانیوں میں تین موضوعات سامنے آتے ہیں۔خود کو نئے انداز سے دیکھنا، خاندان کے دائرے میں اپنی بات پر اصرار کرنا، سماج کا سامنا کرنا۔ان کہانیوں میں خواتین نے اپنے سماجی اور ثقافتی حوالے سے اپنے وجود کی پہچان اور خواتین کے سماجی رول پر زور دیا ہے۔

پہلے حصے کی کہانیوں میں سعودی عورت اور لڑکیوں کی اپنی الگ شناخت کے حوالے سے سوال اٹھائے گئے ہیں جیسے ''سعودی عورت کون ہے؟''،'' اسے کیا ہونا چاہئے؟'' اور'' اس کے ساتھ کس طرح کا برتاؤ ہونا چاہئے؟'' نجاۃ خیاط نے اپنی کہانی ''اگر میں مرد ہوتی؟'' میں عورت کو ایک اسباب تجارت کی طرح بیچنے پر ایک لڑکی کا احتجاج دکھایا ہے۔ بدریہ البشر کی کہانی ''اسکول ڈائری'' میں ایک کم عمر لڑکی تین چیزوں سے آزادی چاہتی ہے: کثیر الازدواجی، مردوں کی حکمرانی اور عورتوں پر جبر و ظلم۔ ''خوشی اور غم کے آنسو'' میں جمیلہ فطانی نے تعلیم اور اسکے ذریعے عورتوں کو ملنے والی آزادی پر زور دیا ہے۔ انکی ایک اور کہانی ''میں اس جیسی کیوں نہیں ہوں'' میں دوسری شادی کے بعد سوتیلی ماں کے رویے اور بیٹی کے تئیں باپ کی لاپرواہی کا مسئلہ اپنی ساری اذیتوں کیساتھ موجود ہے۔ لیکن اسی کہانی میں اسی گھر کی ایک لڑکی کا اپنی سوتیلی بہن کے لئے پیار اور انصاف کی مانگ کرنا لڑکی کی آزادانہ سوچ کا مظہر ہے۔ کچھ کہانیاں سماج اور خاندان میں کسی طور سمجھوتا کر کے اپنی زندگی بسر کرتی نظر آتی ہیں۔ ان میں کچھ حالات کا چیلنج بہادری سے قبول کرتی ہیں اور کچھ اس میں ناکام ہو جاتی ہیں۔

''مکمل سکون''، شریفہ الشملان کی کہانی اپنے ماحول کے قاعدے قانون کا پاس کرتے ہوئے ایک بااعتماد لڑکی کی جھلک دکھلاتی ہے۔ اس کہانی میں اس لڑکی کو مردوں کی سرپرستی اور نگہبانی کی ضرورت نہیں۔ وفأ منور کی کہانی ''ملازمت پیشہ عورتوں کی ذمہ داریاں'' میں نئی نسل کی ملازمت پیشہ خاتون سے ملاقات ہوتی ہے جو اچھی ماں بھی ہے، بیوی بھی ہے اور اچھی میزبان بھی ہے۔ ''نسوانیت کا جشن'' میں فاطمہ العتیبی ایک لڑکی کے کردار میں یہ دکھاتی ہیں کہ اگر مرد دورِ حاضر کے چیلنج نہیں پورے کر سکتے تو پھر عورتیں ایسے بیٹوں کی تربیت کریں جو یہ چیلنج قبول کر

سکیں۔ کچھ کہانیاں جیسے شریفہ الشملان کی کہانی ''زینب'' پدری نظام اور خاندانوں کے جبر کی ایک دردناک داستان ہے۔ فاطمہ العتیبی کی کہانی ''مجھے خواب دیکھنے کا حق دو'' میں دکھایا گیا ہے کہ اپنے شوہر کے خوابوں اور عزائم کی حصولی کے دوران کس طرح ایک عورت کھو جاتی ہے اور اپنا وجود بھی بھلا دیتی ہے۔ ''فاختہ ایک عورت ہے'' میں ناقابل برداشت حالات کا شکار عورت نفسیاتی مریض بن جاتی ہے۔

دوسرے حصّے میں غربت، شراب، نشہ آور دواؤں کا استعمال، بانجھ پن، بے وفائی جیسے مسائل کے تناظر میں عورتوں کی کہانیاں ہیں۔

خیریہ السقاف کی کہانی ''نقصان'' میں دکھایا گیا ہے کہ طلاق اور غربت کا شکار اک بدنصیب عورت کس طرح غلط قسم کے لوگوں کے ہاتھوں انجانے میں نشہ آور دواؤں کے ریکٹ میں گھر جاتی ہے۔ فاطمہ الدواسری کی کہانی ''زعفران'' میں غربت ایک زعفران بیچنے والے بوڑھے کے روپ میں نظر آتی ہے اور ایک مڈل کلاس عورت کی ہمدردی کا جذبہ دکھایا گیا ہے۔ بانجھ پن سے متعلق امل عبدالحمید کی کہانی میں عجیب بات ہے کہ اس میں لکھنے والی نے بھی بغیر کسی تصدیق کے شادی شدہ جوڑے کے لاولد ہونے کی وجہ صرف عورت کو مانا ہے مگر تعلیم اور کیریئر نے اس عورت کو اعتماد عطا کیا۔ اس کہانی میں خاص بات یہ ہے کہ تعلیم اور خودکفیل ہونے کی ترغیب لڑکی کو اسکی بوڑھی ماں دیتی ہے۔ ''بدھ کی رات'' شراب کے عادی شوہر کی داستان ہے جسکی بیوی کی زندگی پوری طرح اس کے گرد ہی گھومتی ہے اور وہ ہر وقت ایک خوف میں مبتلا رہتی ہے۔

تیسرے حصّے میں محبت اور رومان کہانیوں کا مرکز ہے۔ ان کہانیوں میں محبت بدلتے ہوئے زمانے میں اپنے نئے روپ میں بھی نظر آتی ہے۔ ''میں واپس نہیں آؤں گی'' میں قماشہ العلیان نے ایک ایسی عورت کو پیش کیا ہے جو اپنی

خاندان کے ذریعے طے کی گئی شادی میں محبت کے فقدان کو قبول نہیں کرتی اور اس سے نہ صرف رشتہ توڑ لیتی ہے بلکہ بعد میں محبت اور دوستی کی بنیاد پر اک نئی شادی کر کے خوش رہتی ہے۔

چوتھے حصّے میں وہ کہانیاں شامل ہیں جن کا مرکز صرف عورتیں ہی نہیں ہیں۔ پرانی لوک کہانیاں اور روایات بھی لکھنے والیوں کا اتنا ہی اہم ورثہ ہیں جتنی خود ان کی شناخت اور مسائل۔

عذرا نقوی

اگست ۲۰۰۸ء ریاض

☆☆☆

قلم کار خواتین کا مختصر تعارف

امل عبدالحمید: یہ ان کا قلمی نام ہے۔ اصل نام فاطمہ الساغ ہے۔ مکۂ مکرمہ میں پلی بڑھیں اور وہیں ام القریٰ یونیورسٹی سے عربی میں ایم اے کیا۔ ان کی کہانیوں کا مجموعہ ''عمر الزمان'' (From the age of time) 1985ء میں شائع ہو چکا ہے۔ ان کی کہانیاں مکۂ مکرمہ کے مقامی اخباروں میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔

لمیاء باعشن: یہ جدہ میں پیدا ہوئیں اور امریکہ میں تعلیم حاصل کی۔ وہاں کی اریزونا یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی، جدہ کے یورپین زبانوں کے شعبے میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔ کہانیاں لکھنے کے علاوہ انگریزی سے عربی میں ترجمے بھی کرتی ہیں۔ انھوں نے عربی لوک کہانیوں کا مجموعہ ''التبات والنبات'' کے نام سے 1995ء میں ترتیب دیا ہے۔

بدریہ البشر: ریاض میں پیدا ہوئیں۔ سوشیالوجی میں ایم اے اور پھر پی ایچ ڈی کی۔ کہانیوں کے دو مجموعے 1992ء ''نہایہ اللعبۃ'' (کھیل ختم ہوا) اور ''مسا الاربعا'' (بدھ کی شام) 1994ء میں شائع ہو چکے ہیں۔ ایک ناول ''خریف الشارس'' (Vicious Fall) بھی منظر عام پر آ چکا ہے۔

سارہ بوحیمد: سعودی عرب کے شہر الخبر میں پیدا ہوئیں، تعلیم بحرین میں اور پھر لبنان میں حاصل کی۔ کئی دہائیوں تک ایک مڈل اسکول کی پرنسپل رہیں۔ یہ شاعری بھی کرتی ہیں، ان کی کہانیاں سعودی رسالوں اور اخباروں میں شائع ہوتی ہیں۔

فاطمہ الدوسری: اس کہانیوں کے مجموعے میں سب سے کم عمر لکھنے والی ہیں۔

انکی کہانیاں جو سعودی اخباروں میں شائع ہوتی ہیں ان کا موضوع مملکت سعودی عرب میں ماڈرن زندگی کے مسائل ہیں۔

منیٰ الذکیر: انھوں نے قاہرہ یونیورسٹی سے تاریخ میں بی۔اے کیا اور پھر ایکسٹر یونیورسٹی میں انگلش کی تعلیم حاصل کی۔ پیشے کے لحاظ سے صحافی ہیں۔ان کے مضامین کا مجموعہ ''کلمات آلاخرین'' (Words for Others 1981) میں شائع ہوا اور کہانیوں کا مجموعہ ''ظلال سحریہ'' (Magic Shadows طلسمی پرچھائیاں، 1993ء) میں شائع ہوا۔

جمیلہ فطانی: انھوں نے عربی زبان میں بی اے کیا اور پھر ریاض میں ایجوکیشنل ڈیپارٹمنٹ سے منسلک ہوگئیں۔ روزنامہ الریاض کی ایڈیٹر بھی رہ چکی ہیں۔ شاعر اور صحافی ہیں۔اخبارات میں سماجی اور ادبی موضوعات پر مضامین لکھتی ہیں۔ ان کی کہانیوں کا مجموعہ ''النصار علی المستحیل'' (Victory Over Impossible ناممکنات پر فتح۔ 1990ء) میں شائع ہوا تھا انکی کچھ کہانیوں کی ڈرامائی تشکیل سعودی ریڈیو سے بھی پیش کی گئی تھی۔

نورہ الغامدی: انھوں نے ریاض سے عربی زبان میں بی اے کیا۔ انھوں نے بہت کم عمری سے لکھنا شروع کردیا تھا۔ ان کی کہانیوں کے دو مجموعے ''عفواً لازلت اُحلم'' (sorry, I am still dreaming, معاف کیجئے میں ابھی خواب دیکھ رہی ہوں ۔1995ء) میں (Art of a Night, رات کا پہر 1997ء) شائع ہو چکے ہیں۔

سمیرہ خاشقجی: (1940ء-1986ء) سعودی عرب میں پیدا ہوئیں مگر زیادہ تر سعودی عرب سے باہر رہیں۔انھوں نے عورتوں کے لئے ایک مشہور رسالہ ''الشقیۃ'' کا اجرا کیا اور اس کی ایڈیٹر رہیں۔عورتوں کے مسائل ان کی تحریروں میں خاص اہمیت رکھتے ہیں اور اس کے علاوہ یہ خواتین کی کئی تنظیموں اور فلاحی کاموں کی بھی روح رواں تھیں۔ان کے کئی ناول اور کہانیوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں:

"وداعت آمالی"(Farwell to my Dreams. 1958)،"ذکریات دامعتہ" (Tearful memories)،"وراالضباب" (Beyound the Clouds 1971ء)،"قطرات من الدموع"(Teardrops, 1971)،اور"رحلتہ الحیاۃ" (A Journey of Life, 1984)۔

نجاۃ خیاط:سعودی عرب کی اولین لکھنے والیوں میں سے ہیں۔ بیروت میں تعلیم حاصل کی، پیشے سے صحافی ہیں اور عورتوں کے مسائل کے بارے میں لکھتی ہیں۔اخباروں میں ان کی کہانیاں شائع ہوتی رہتی ہیں اور ایک مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔"مخاض الصمت"(Pain of Silence, 1966)

وفاؑ منور: مکہ المکرّمہ میں پیدا ہوئیں اورام القریٰ یونیورسٹی سے آرٹ ایجوکیشن کی تعلیم حاصل کی۔ان کی بیشتر کہانیاں روزنامہ"الریاض" کے ادبی صفحات میں شائع ہوئیں۔یہ آرٹسٹ بھی ہیں،ان کے فن پاروں کی کئی نمائشیں سعودی عرب اور دیگر ممالک میں ہو چکی ہیں۔ان کی کہانیوں کا مجموعہ ہے"الرقص علی الجراح" (Dance on Wounds, 1990)۔

خیریہ السقاف: مکہ المکرّمہ میں پیدا ہوئیں اور کنگ سعود یونیورسٹی، ریاض سے عربی میں بی۔اے کیا اور پھر امریکہ جا کر مسوری یونیورسٹی سے ایجوکیشن میں ایم۔اے کیا۔ریاض کی کی امام محمد بن سعود یونیورسٹی سے 1988ء میں پی۔ایچ۔ڈی کی۔کنگ سعود یونیورسٹی کے خواتین کے کالج کی ڈین بھی رہیں۔صحافت ان کا خاص میدان ہے۔روزنامہ"الریاض" کی خواتین کے سکشن کی مدیر ہیں۔ان کی کہانیوں کا ایک ہی مجموعہ"نحوالابعاد"(Taking off in the Distance, 1982) ہے اسکی کئی کہانیاں انگریزی میں ترجمہ ہو کر شائع ہو چکی ہیں۔

شریفہ الشملان: جنوبی عراق میں پیدا ہوئیں پھر سعودی عرب میں آ کر صحافت میں بی۔اے کیا۔سعودی عرب کی وزارتِ سماجی،منطقۂ شرقیہ میں ڈائریکٹر رہیں۔اخباروں میں ادبی مضامین لکھتی ہیں۔کہانیوں کے دو مجموعے شائع ہو چکے

ہیں۔ ''منتہی الھدوٗ'' (Eternal Tranquility,1988)، ''مقاطع من حیاۃ'' (Episods of Life,1991)، ''وغداً یاتی''، (Tomorrow {he} will Come)۔

قماشہ العلیان: سعودی عرب کے منطقۂ شرقیہ میں رہتی ہیں۔ صحافی ہیں اور متحدہ عرب امارات کے رسالے ''کلّ الاسرۃ'' میں ہفتے وار کالم لکھتی ہیں۔ کہانیوں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ''خطأ فی حیاتی''، (Mistake in My life,1992)، اور ''الزوجۃ العذرا''، (A Virgin Wife,1992)۔

فاطمہ العتیبی: عربی زبان میں بی۔ اے کیا اور ریاض کے ایک اسکول میں ٹیچر ہیں اور صحافی بھی ہیں۔ ریاض سے نکلنے والے دبی رسالے ''المجلۃ العربیۃ'' میں مضامین لکھتی ہیں۔ کہانیوں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ''احتفال بانی امراۃ''، (Celebrating Being a Woman,1991)، اور ''دفءَ یدھا'' (Her hand's Warmth,1995)۔

رجاء علیم: انھوں نے انگریزی ادب میں بی اے کیا۔ جدہ میں کنڈر گارٹن استانیوں کے ٹریننگ کالج میں پڑھاتی ہیں۔ یہ اپنے مخصوص انداز کی نثر کے لئے سعودی عرب میں مشہور ہیں ان کی نثر میں پرانے قصّے اور موضوعات جدید انداز میں پیش کئے جاتے ہیں۔

ان کے تین ناول، افسانوں کا مجموعہ ''نہر الحیوان'' اور کئی ڈرامے شائع ہو چکے ہیں۔

رجاء کئی اہم بین الاقوامی اعزازات حاصل کر چکی ہیں۔

☆☆☆

نقشِ نظر

محمد طارق غازی

افسانہ نگاری تلمیح واستعارہ کی زبان میں سچ کہنے کی کوشش کا نام ہے. شاعری کی طرح افسانہ بھی مبالغہ کا مطالبہ کرتا ہے جس سے، شعر ہی کی طرح، واقعہ کی تاثیر میں اضافہ کرنا مقصود ہوتا ہے۔ شاعری جذبات کو الفاظ دینے کا نام ہے اور افسانہ واقعات کو کردار دینے کا۔ معاشرہ کے بارے میں سچ یا جھوٹ کا محور یہی افسانوی کردار ہوتے ہیں کردار سچے ہوں تو معاشرہ اپنی تہوں سے باہر جھانکتا ہے، اور کرداروں میں جھول ہو تو سماج بجائے خود ایک ایسا ملزم بن جاتا ہے جو بیانِ صفائی کے حق سے دست بردار ہو جائے: ایک ایسا سماج جس کے باشندے خود اپنی نگاہوں میں حقیر ہوں۔ سچ کی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک وہ بات جو کسی معاشرہ میں سچ کے طور پر رائج ہو اور دوسرا کائناتی سچ۔ قصہ نویسی میں کسی مروجہ سچ کے بیان سے ایک معاشرے کے تہذیبی اور ثقافتی مقام کا اندازہ قائم ہوتا ہے، اور کائناتی سچ کی گونج یا سرگوشی سے شہ پارہ وجود میں آسکتا ہے۔ افسانے کے معیار اور تاثیر کا فیصلہ اسی بنیاد پر ہوتا ہے کہ سچ کہنے کی کوشش میں افسانہ نگار کو کس درجہ کامیابی ہوئی ہے۔ اور اسی کامیابی پر خود افسانہ نگار کے فنی اور تخلیقی وجود کا انحصار ہوتا ہے۔

لسانی تاریخ بتاتی ہے کہ زبانوں کی زندگی میں کچھ دور ایسے آتے ہیں جب سچ سماج کے اظہار کا اٹوٹ حصہ ہوتا ہے، تخلیق کرنے کی چیز نہیں، اسی لئے اپنے ان ادوار میں تخلیق کی سطح پر ہر زبان داستانوں کے اسلوب میں سچائیوں کی نفی سے عبارت ہوتی ہے۔ یونانی میں اوڈیسی اور ایلیاڈ، عربی میں الف لیلہ، لاطینی میں

اینیاڈ، سنسکرت میں ساوتری، انگریزی میں کینٹر بری ٹیلس کی بعض کہانیاں اور کیٹس کی منظوم داستان اِنڈیمئن، اردو میں قصہ گل بکاؤلی، طلسم ہوشربا اور فسانۂ عجائب کا تعلق اسی سچ کی نفی سے ہے۔ تاہم ان عموماً طویل داستانوں میں بھی کہیں کہیں سہی زندگی کی تلخ و شیریں حقیقتیں بیان میں آجاتی ہیں۔ نیا افسانہ زندگی کی تلخیوں سے زیادہ نسبت رکھتا ہے۔ اسی لئے کسی معاشرہ کی مزاج شناسی کے لئے اس دور میں لکھے جانے والے افسانوں کے سچ اور غیر سچ کا فہم مقابلتاً زیادہ اہم ہے۔ یہ مجبوری داستانوں کے ساتھ نہیں ہوتی۔

افسانہ نگار اور اس کے پڑھنے والے کی زبان اور معاشرہ ایک ہی ہو تو کوئی بڑا مسئلہ پیدا نہیں ہوتا کیونکہ پڑھنے والوں کو اپنے سماج کی سچائیوں کا علم ہوتا ہے، کبھی کبھی لکھنے والے سے زیادہ۔ لیکن ترجمہ کردہ کہانی کے پڑھنے والے چونکہ ایک مختلف زبان بولتے ہیں اور ایک مختلف معاشرہ میں رہتے ہیں اس لئے انہیں ایک اجنبی معاشرے اور اس کی سچائیوں اور غیر سچائیوں کا سارا علم ان ترجمہ کہانیوں ہی سے ہوتا ہے۔ مغائرت کا سبب کرداروں اور مقامات کے نامانوس نام، اور کبھی کبھی ان کے ناقابل ادائیگی ہجے اور تلفظ بھی ہو سکتے ہیں۔ محاورہ اور روزمرہ بھی آڑ بن جاتے ہیں۔ اور اسی بنا پر اندیشہ ہوتا ہے کہ ایک غیر معاشرہ میں کسی اور جگہ مروجہ کوئی سچائی سچ نہ بن سکے یا کسی ناسچ کو سچ سمجھ لیا جائے۔ تاہم افسانوں کو عمرانیاتی پس منظر میں پڑھنے والوں کو اصل دلچسپی ایک اجنبی معاشرہ کے مطالعہ سے ہوتی ہے اور ان کے تجزیے کا تمام تر انحصار افسانہ نگار کے مہیا کردہ حقائق پر ہوتا ہے۔ اسی مقام پر کسی افسانے کے سچ یا ناسچ کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اور یہیں سے تراجم پر ادبی تنقید کی راہ کھلتی ہے۔

یہ مسائل اس لئے پیدا ہوتے ہیں کہ اصولی طور پر ہر زبان اور ہر ملک کا افسانہ اس کی اپنی ثقافت اور طرز زندگی سے ابھرتا ہے۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ لکھنے والوں کے نظریات اور خود زندگی کے بارے میں ان کی انفرادی پسند و ناپسند کی گہری چھاپ بھی ان کے بیان میں ہوتی ہے۔ یہاں بھی وہی اڑچن سامنے آتی ہے کہ اپنی

زبان کے کہانی کار کے نظریات اور افکار کی نہج سے پڑھنے والے عام طور سے واقف ہوتے ہیں اور اسی بنیاد پر کہانی کے اور خود اپنے معاشرے کے سچ اور ناسچ کی پہچان کرتے ہیں۔ مگر جب کہانی کار اور اس کے افکار غیر معروف ہوں تو کہانی کے بیانیہ اور بین السطور سے افسانہ نگار کے نظریات کی پہچان کے بعد ہی افسانے کے معاشرہ کی سچائیوں اور غیر سچائیوں کا اندازہ قائم کرنیکی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ مشکل ہی نہیں خاصا خطرناک عمل ہوتا ہے۔ زیادہ مشکل کا شکار خود مترجم ہوتا ہے۔

عذرا نقوی کی مشکل دونی تھی کہ انہوں نے اس مجموعے کے افسانے راست عربی سے نہیں بلکہ ان کے انگریزی ترجموں سے اردو میں منتقل کئے ہیں۔ تاہم دو باتیں ایسی ہیں جن سے ان تراجم کا اعتبار قائم ہوتا ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ عذرا نقوی نے خاصا طویل وقت سعودی مملکت میں گزارا ہے اور اس کے باجود کہ اُس ملک کی عورتیں تو کجا مرد بھی بیرونی دنیا کے مہمان کارکنوں سے سماجی اور خاندانی ربط و تعلق نہیں رکھتے، عذرا نقوی کو آزاد صحافت کی راہ سے جزیرۃ العرب کے عصری معاشرہ کے مطالعہ کا خاصا موقعہ ملا ہے۔ چنانچہ وہ ان عربی افسانوں کی دنیا کی سچائیوں کا قابل لحاظ علم اور اندازہ رکھتی ہیں اور اسی بنا پر ان قصوں کی اصل فضا کو برقرار رکھنے میں بڑی حد تک کامیاب ہوئی ہیں۔ دوسری بات یہ کہ عذرا نقوی بذات خود اردو کی ایک معروف افسانہ نگار ہیں اور زبان و بیان پر قدرت رکھتی ہیں جسے ایک علمی ادبی خاندان سے تعلق اور ایک ادب شناس شوہر کی رفاقت نے مزید جلا دی ہے۔ اس وصف نے ان افسانوں کے ترجمے میں ان کی بڑی مدد کی ہے۔ ورنہ کسی فن پارے کو جب دوسری سے تیسری زبان میں منتقل کیا جاتا ہے تو عام طور سے تکلف، آورد اور تعقید کے نتیجے میں بیان کمزور اور بے اثر ہو جاتا ہے۔ یہ سقم ان تراجم میں نہیں ہے۔

عربی سے انگریزی میں ترجمہ کرنے والوں نے اس مجموعے کو تبدیلی کی آوازیں قرار دیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ عنوان خود مغربی مترجمین یا جدید تعلیم یافتہ مملکتی مرتبین کے اپنے ذہن کا آئینہ دار ہو۔ ضروری نہیں کہ اپنے سماج کے بارے میں اس

مجموعے کی افسانہ نگار خواتین کا نقطۂ نظر بھی وہی ہو جو مترجمین کا ہے یہ کھوج اور تحقیق کا کام ہے۔اس زاویئے سے ان افسانوں کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہیں ہوگا۔مگر دو ایک نکتے ذہن میں رکھنے ضروری ہیں۔تمام افسانہ نگار خواتین جدید تعلیم یافتہ ہیں۔اکثر کا تعلق صحافت یا درس وتدریس سے ہے۔بعض کا تعلق سعودی مملکت کے معاشرے میں جدت پسند اور وسیع المشرب خاندانوں سے ہے۔معاشرتی تبدیلی کے بارے میں ان قلم کاروں کا مطمح نظر کسی درجہ میں باغیانہ یا کم از کم انقلابی ہوسکتا تھا۔مگر ان کہانیوں میں نہ بغاوت کی بو ہے نہ انقلاب کی آہٹ۔ان افسانوں کو ان کیفیات سے پہلے کی حالت کا بیانیہ سمجھا جاسکتا ہے۔تمام افسانہ نگار خواتین اپنے معاشرے کی کچھ تکلیف دہ حقیقتوں کی پردہ کشائی کرتی ہیں۔انتخاب میں عموماً منفی رجحانات کی عکاسی پر زور ہے، معاشرے کے مثبت پہلو واضح نہیں ہوتے۔بنیادی طور پر یہ ایک رجولی معاشرے کے قصے ہیں جو ایک ایسے قبائلی خمیر سے اٹھتے ہیں جسے برقرار رکھنا اور فروغ دینا وہاں کے سیاسی مزاج کی اپنی مصلحتوں کا تقاضہ ہے۔افسانہ نگار خواتین جس تبدیلی کا تاثر دیتی ہیں وہ بہت سطحی اور عورت کے ذاتی وجود میں سمٹی ہوئی ہے۔اظہار کی یہ کیفیت اس معاشرہ پر بجائے خود ایک تبصرہ اور ان کہانیوں کا مرتب کردہ ایک سچ ہے۔

اجمالی طور پر یہ غیر مربوط انسانی رشتوں کے بنائے ہوئے ایک ایسے معاشرے کی کہانیاں ہیں جو بیک وقت اعلیٰ درجہ کی تعلیم اور ادنیٰ درجہ کی جہالت کا شکار ہے اور دو انتہاؤں کے درمیان اپنے نقطۂ اعتدال کو نہیں پہچانتا۔اس انتخاب کے تمام افسانے معاشرتی عدم توازن کی مثالوں سے عبارت ہیں: اعلیٰ تعلیم یافتہ مرد جن کی بیویاں غیر تعلیم یافتہ ہیں، اپنے شوہروں کی روز وشب کی عام ضرورتیں تو پوری کر دیتی ہیں مگر ان کی زندگی کی ساتھی نہیں ہیں، اور اپنے احساس کمتری میں سمٹی ہوئی ہیں۔تعلیم یافتہ عورتیں جو پیشہ ورانہ زندگی کے بخشے ہوئے احساس برتری کی دہلیز پر کھڑی ہوئی اپنے تشخص کی داستان رقم کر رہی ہیں۔ذی شعور لوگ جن کو سماج ان کے علم اور فہم اور

فکر کے ساتھ مسترد کر دیتا ہے، یا جو خود اسی امتیاز کی وجہ سے اپنے معاشرہ سے کٹ جاتے ہیں، جہلا جن کے مزاجوں کے بھیڑیئے دو مضبوط قدموں پر ایستادہ سرو قامت انسان کی شبیہ کو بھنبھوڑتے رہتے ہیں۔ باراں دیدہ عورتیں جو کسی نازک موڑ پر زندگیوں کو عذاب بنا دینے میں مہارت رکھتی ہیں۔ دوشیزائیں جو دنیا کی ہر نوخیز لڑکی کی مانند رنگین مرغولوں میں لہراتے ہوئے خواب دیکھتی ہیں مگر جنہیں زندگی کی سبک، سپاٹ، کھردری اور ناہموار حقیقتوں کا احساس نہ گھر میں باپ یا بھائی دلاتے ہیں نہ اسکولوں میں استانیاں۔

سماجی عدم توازن اور رشتوں کی بے ربطی کے احساس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ انہیں موضوعات پر کسی مرد قلم کار کی کوئی تخلیق پڑھنے والوں کے سامنے نہیں ہے۔ چنانچہ حتمی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ سعودی مملکت میں یہی سب معاشرتی اور عمرانی حقیقت ہے. پھر بھی یہ ایک بڑی حقیقت کے چند تاریک پہلو ضرور ہیں، اور تکلیف دہ ہیں۔ پڑھنے والوں کے لئے بھی اور لکھنے والیوں کے لئے بھی جو اپنے معاشرے کو اس تکلیف کا احساس دلانا چاہتی ہیں۔ یہ افسانہ نگار خواتین جو کچھ اپنے گرد و پیش دیکھ رہی ہیں اس کے کچھ بدنما پہلوؤں کو قلمی خوردبین کے سامنے لے آئی ہیں۔ البتہ اس نوعیت کا اظہار دیگر مشرقی معاشروں میں غلط فہمی کا باعث بن سکتا ہے۔ مگر پھر مشرق سے وہاں کچھ زیادہ تعلق خاطر بھی نہیں ہے جو کوئی مسئلہ پیدا ہو۔

بعض افسانوں میں معاشرہ کا حسن بھی پیش کیا گیا ہے مگر تکنیک، ترتیب اور بیان کی کمزوریاں ان مناظر کے رنگ نہیں ابھرتے دیتیں: فاطمہ الدوسری (زعفران)، جمیلہ فتانی (دیوانہ، میں اس جیسی کیوں نہیں ہوں)، لمعیہ باعشن (ایک پر والی چڑیا)، نورا الغامدی (برقان کی روح) اور قماشہ العلیان (میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا) اپنے معاشرہ کو فکر کے زیادہ بلند نقطے سے دیکھتی ہیں اس لئے ان کا پیش منظر وسیع اور گہرا ہے، مگر ان کے سامنے اس منظر کے نشیب و فراز بہت واضح نہیں ہیں۔ ایک اور قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ ان افسانوں، خاص طور سے خزاں کی

راتیں (سمیرہ خاشقجی) اورنسوانیت کا جشن (نورا الغامدی) سے گمان ہوتا ہے کہ عہد جدید کی مملکتی عورت تعلیم کے باوجود اپنی مغربی ہمزاد کی طرح نسائی نفسیات سے بالکل کٹ نہیں گئی۔ یہ عبوری دور کا فسانہ بھی ہوسکتا ہے اور ماضی میں بہت دور تک پیوست ایک سماج کے ایک کائناتی سچ کا شاخسانہ بھی۔ یہ ایک اہم عمرانیاتی نکتہ ہے۔انتخاب میں اس نکتے پر بطور موضوع زیادہ اصرار نہیں ہے، اگر چہ کچھ افسانوں میں اشارے مل جاتے ہیں۔اس اعتبار سے بھی یہ افسانے توجہ کا مطالبہ کرتے ہیں۔

اردو قالب میں سعودی مملکت کی فنکاراؤں کا یہ پہلا افسانوی مجموعہ ہے جس سے وہاں کے تیغہ بند سماج کا اجمالی تعارف ہوتا ہے۔عذرا نقوی نے یہ افسانے جوں کے توں ناظرین کے سامنے رکھ دئے ہیں.اسی کے ساتھ اس انتخاب کی ہر فنکارہ کا مختصر تعارف بھی کروادیا ہے جو اِن افسانوں کی دنیا میں داخل ہونے کا راستہ ہے۔ ان افسانوں سے مملکتی معاشرے کو ادبی جہت سے جاننے کا دروازہ کھلتا ہے۔ یہ انتخاب ایک ایسے معاشرے سے اردو میں مطالعاتی دلچسپی پیدا کرتا ہے جو محاوراتی دیوار گریہ اور محاکاتی دیوار قہقہہ کے درمیان کہیں خود کو ڈھونڈ رہا ہے۔ یہ افسانے ان دیواروں میں روزنیں پیدا کر کے اُس پار نظارہ کی دعوت دیتے ہیں۔

محمد طارق غازی

آٹوا، کنیڈا- ۲۸ جون ۲۰۰۸

پہلا حصّہ

اگر میں مرد ہوتی

نجاۃ خیاط

آپ سنیں گے تو حیرت ہوگی کہ میری قیمت صرف تین ہزار ریال تھی جو میرے ماموں کو نقد ادا کی گئی تھی۔ ایک رات کچھ لوگوں کی بیٹھک میرے ماموں کے گھر پر ہوئی اور سورۃ فاتحہ پڑھ کر میری آزادی اور لڑکپن کا خاتمہ کر دیا گیا۔ ویسے تو یہ رسم میرے گھر پر ہونی چاہیئے تھی اور میرے والد کو میری قیمت وصول کرنی چاہیئے تھی مگر شاید قسمت نے ان کو یہ ''بھاری بوجھ'' اٹھانے سے بچالیا۔ انکو موت آ گئی اور وہ ماں اور میری زندگی سے غائب ہو گئے۔

غربت میں میری ماں نے اللہ کی قدرت کے سامنے سر جھکا دیا کہ میں لڑکی ہوں۔ اگر میں لڑکا ہوتی تو میرے باپ کے گھر کا دروازہ میرے لئے کھلا ہوتا اور ہمیں اپنے ماموں کے ٹکڑوں پر نہ پلنا پڑتا۔ اگر میں مرد ہوتی تو مشکل وقت میں ماں کی ڈھال بن گئی ہوتی۔

اس رات کی جو بیٹھک ہوئی تب پہلی بار میرے دل میں غصہ کا ابال آیا کہ میں ایک عورت کیوں ہوں۔ میرے اندر عورت ہونے کی ذلت سرائیت کر گئی۔ عورت ہونے کے ناطے سماج مجھے اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ میں خود کام کروں اور دوسروں کی مدد پر انحصار کرنے کی ذلت سے بچ پاؤں۔ سماج کو یہ گوارا نہیں کہ میں باہر نکل کر سورج کی روشنی دیکھوں، اس کی گرمی محسوس کروں، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ کوئی زہریلی مکھی مجھے ڈنک مار دے۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں سڑتے ہوئے اندھیرے میں رہوں اور کثافت مجھے کھا جائے، وہ اسے تحفظ کہتے ہیں۔

نہیں میں نے احتجاج نہیں کیا، میں دکھ سہتی رہی اور اندر اندر گھٹتی رہی۔ میں عورت ہوں نا؟

جب وہ اجنبی بدصورت بڑھیا عورت ہمارے دروازے پر آئی اور ماں سے عبایہ سینے کے لئے کہا تو ماں نے چین کا سانس لیا۔ انھوں نے اس کا گرم جوشی سے استقبال کیا اور گھر کے اندر لے آئی، باوجود اس کے کہ ماں کو قینچی تک نہیں پکڑنی آتی تھی عبایہ سینا تو دور کی بات ہے۔ مگر میری ماں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ عورت کون ہے اور وہ ایسے گھر سے کیا چاہتی ہے جہاں ایک خوبصورت نوجوان لڑکی ہے جو اس کے بیٹے کی دلہن بن سکتی ہے۔ یہ سب باتیں میرے دماغ میں گھومنے لگیں جب میں نے دیکھا کہ ماں اس عورت سے بہت تپاک سے مل رہی ہیں۔ میں ان دونوں کو بہت تجسس سے دیکھ رہی تھی۔

پھر میں نے دیکھا کہ ماں تیزی سے میری طرف آئیں "بال بنا لو، کوئی شوخ سا لباس پہن لو اور مہمان کیلئے ایک کپ قہوہ بنا لاؤ"۔ میں نے جلدی سے وہی کیا جو میری ماں نے کہا تھا اور شرماتی ہوئی، ٹرے میں مہمان کے لئے قہوے کا کپ لیے کمرے میں داخل ہوئی۔

اس عورت نے مجھے نگاہوں سے پرکھا اور مسکرائی۔ میں نے تمیز سے سر جھکا لیا۔ اس کی آنکھیں چالاک بلی کی طرح میرا جائزہ لے رہی تھیں جیسے شاید میرے جسم میں کچھ مصنوعی ہو۔ جیسے شاید میں نے لکڑی کے ناخن یا سیپ کے دانت لگا رکھے ہوں۔

جب اس کو اطمینان ہو گیا کہ بکاؤ مال اللہ کا ہی بنایا ہوا ہے اور میری خوبصورتی میں کچھ مصنوعی نہیں ہے تو میری ماں اور اس بدصورت عورت کے بیچ سرگوشیوں میں معاملہ طے ہو گیا۔

حالانکہ ہمارے معاشرے میں معیوب ہے مگر میں نے یہ اہم گفتگو سن لی جس میں میری زندگی ایک مرد کو بیچ دی گئی تھی۔

مگر کون سا آدمی؟ وہ اگر اس عورت کا بیٹا ہوتا تب یہ معاملہ طے کرنے کی کوئی تک بھی تھی، مگر یہ تو اس کا بھائی تھا اس سے صرف دو سال چھوٹا، زندگی میں خوب کھایا کھیلا ہوا، اور اب ریٹائر ہونا چاہتا تھا ایک لذیذ کھانے کے ساتھ۔ وہ کھانا

جوشایداس کی چٹخارے دار زندگی واپس لا سکے۔

میری ماں گھبرائی گھبرائی، ہاتھ ملتی ہوئی یہ اہم اور ہنگامی خبر ماموں کو بتانے کیلئے دوڑی گئیں۔

"یا اخی! وہ ہر طرح سے مناسب ہے، ایک گھر اور کئی دوکانوں کا مالک ہے، معقول ہے۔ اسکی کپڑے کی ایک دوکان بھی ہے۔ وہ ایک پختہ عمر کا، سمجھدار اور متوازن آدمی ہے۔ وہ اسکی اچھی طرح دیکھ بھال کر سکے گا، وہ بہت چھوٹی عمر کی ہے نا۔ اسکا خیال رکھے گا، اسے وہ ریشمی کپڑے پہننے کو دے گا جس کے وہ خواب دیکھتی ہے....."

میرے ماموں ماں کی بات سن کر مطمئن سے لگ رہے تھے۔" بہنا! تمھیں اچھا لگا ہے تو ٹھیک ہے، مجھے اس شادی پر کوئی اعتراض نہیں"۔ پھر انھوں نے ایسا ظاہر کیا کہ جیسے کچھ سوچ رہے ہوں اور بولے" تھوڑا رکو! ذرا میں آس پڑوس میں اس کے بارے میں معلومات کرلوں۔ دیکھوں کوئی اسے جانتا بھی ہے کہ نہیں۔"

میری ماں نے جلدی سے کہا" کوئی ضرورت نہیں بھائی، اسکی بہن نے مجھے اسکی زندگی اور چال چلن کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ اسکی آمدنی میں میری بیٹی آرام سے رہے گی بلکہ عیش کریگی۔" میرے ماں نے اس عورت کی باتوں پر یقین کرلیا تھا۔" یہ ہی تو ہمیشہ میں نے اپنی بیٹی کے لئے چاہا تھا؟"

یہ گفتگو بہت جلدی ہی ختم ہوگئی، اس سے بھی جلدی جتنی دیر میں کسی شخص کو عید کے دن کھانے کے لئے ایک چھوٹی سی مرغی بیچی جاتی ہے۔

شادی کے دن میرے دل میں کوئی امنگ نہیں تھی، اور نہ ہی دلہن بننے کی کوئی خوشی۔ میں بہت دکھی تھی اور اپنے عورت ذات ہونے پر بہت غصہ آرہا تھا۔ اگر میں مرد ہوتی تو مجھے اس تابوت میں نہ دفن کیا جاتا جس کو لوگ شادی کا جوڑا کہتے ہیں، اور میرے جنازے کے جشن میں آس پڑوس کی متجسس عورتیں اتنا کھاتا پیتا دولہا مل

جانے پر مجھ پر رشک نہ کر رہی ہوتیں۔ میری عمر کی پندرہ بہاریں خزاں کی سرد خواب گاہ میں نہ دفن ہوتیں جس سے میں ایک دم عمر رسیدہ ہوگئی۔

جلد ہی بہت سی باتیں میں جان گئی جو اس بدصورت بڑھیا نے میری ماں کو نہیں بتائی تھیں۔ میں نے جان لیا کہ ایک ایسا ہنٹر ہے جو انسان ہونے کے احساس کو مار ڈالتا ہے جب بھی یہ احساس مجھ میں سر اُٹھاتا ہے۔ اور بھی باتیں تھیں جن کے بارے میں میری ماں نے بھی نہیں بتایا تھا..... کہ میری معصوم سانسیں ان سڑی ہوئی پھولی سانسوں سے الجھیں گی....... میرے ماموں کے دسترخوان کے جھوٹے باسی ٹکڑے ان نانوں سے کہیں زیادہ میٹھے تھے جن کی ادائیگی کے لئے مجھے ہر رات ایک مردہ جسم کے ساتھ لیٹنا پڑے گا جسکی آنکھیں پتھرائی ہوئی ہیں، جس سے قبر کی بو آتی ہے..... جن کی قیمت مجھے اپنی زندگی سے دینی ہوگی۔

ایکدن جب یہ سب برداشت سے باہر ہوگیا تو میں اپنی ماں سے ملنے گئی، اسکے سینے سے لگ کر اپنی نسوانیت کی تحقیر پر رونے کے لئے۔

''مجھے اس آدمی سے بچالو'' میں نے ایک لڑکی کی معصومیت اور ایک عورت کے کرب کے ساتھ اپنی ماں سے التجا کی۔

میری ماں نے میرے بالوں پر ہاتھ پھیرا، جیسے وہ میرے بندھنوں کو اور کس رہی تھیں۔ ''صبر کرو'' انھوں نے کہا'' ورنہ تم اپنا گھر قاعدے سے نہیں بسا پاؤ گی، ہمارے لئے کوئی اور تحفظ نہیں ہے بیٹی....... تمہارا گھر ہی تمہارا ٹھکانہ اور جائے امان ہے''۔

میرے دل سے ایک چیخ نکلی'' جائے امان؟ تحفظ؟ تو یہ مجھے قید سے آزاد کیا گیا ہے؟ جو بھی پہلا راہ چلتا ملا اس کے ہاتھوں بیچ دیا گیا؟ تم مجھ پر ظلم کر رہی ہو اماں''۔

انھوں نے مجھے سختی سے دیکھا ان کی نگاہیں کہہ رہی تھی'' تم ایک عورت ہو یہ میرا قصور تو نہیں ہے۔ یہ ظلم میں نے تو تم پر نہیں کیا.... کچھ نہیں ہوسکتا''۔

☆☆☆

اسکول کی ڈائریاں

بدریہ البشر

ایک دن میرے والد میری ماں پر چلائے ۔" اگلی جمعرات میں شادی کر کے دوسری عورت کو یہاں لے آؤں گا۔"

میری ماں رونے لگیں، منتیں کرنے لگیں کہ تمہارا اور جو کچھ جی چاہے کرلو مگر نئی بیوی گھر میں نہ لانا۔

جب میرے والد گھر چھوڑ کر کہیں اور رہنے لگے تھے تب میں بہت چھوٹی تھی۔ ہم ان سے بہت کم مل پاتے تھے۔ شروع میں تو وہ ایک دن چھوڑ کر ملنے آتے تھے۔ پھر اس کے بعد وہ صرف جب ہی گھر آتے تھے جب گھر کیلئے مہینے کی جنس اور سودا سلف پہنچانا ہوتا۔ مگر جب میرا بھائی سعید بڑا ہوگیا اور اس نے یہ ذمہ داری سنبھال لی تو والد بالکل ہی غائب ہو گئے۔

سعید روز میرے کمرے کا معائنہ کرتا تھا۔ وہ میری چیزیں تلاش کرتا رہتا تھا اور فون کالز پر بھی کڑی نظر رکھتا تھا۔ پتہ نہیں اسے کس بات کی کھوج لگی رہتی ہے۔ حالانکہ وہ مجھ سے صرف دو سال بڑا تھا مگر اپنے مرد ہونے کی وجہ سے مجھ پر چلانا اپنا پیدائشی حق سمجھتا تھا۔

ایک بار اس نے جب وہ فوٹو پھاڑ دیا جو میں نے اپنی سہیلی کے ساتھ کھنچوایا تھا تو میں خوب روئی تھی۔ وہ کہنے لگا" تم اس میں یہ جو دونوں طرف سے کھلے چاک والا لمبا اسکرٹ پہنے ہو بالکل بے حیا لگ رہی ہو۔" اور خود اس نے میری ایک اور سہیلی کا فوٹو اپنی میز کی دراز میں رکھ لیا تھا۔ میری کتابیں بھی اسکی جانچ پڑتال سے نہیں بچتیں

تھیں۔مگر میں نے اپنی کپڑوں کی الماری میں کتابیں چھپا کر رکھنے کا ایک طریقہ ڈھونڈ لیا تھا۔میرے لمبے گاؤن جو الماری میں ٹنگے ہوتے تھے ان کو کمر کے پاس سے باندھ دیتی تھی اور ان میں کتابیں چھپا دیتی تھی،اپنے مہنگے عطر بھی ایسے ہی چھپا کر رکھتی تھی۔

میں نے کنگھا کر کے بالوں کو پیچھے سمیٹ کر انھیں ایک لال اور سفید کلپ سے باندھ لیا۔پھر سنگھار میز سے لپ اسٹک لے کر دونوں گالوں پر تھوڑی سی لگائی اور اسے پھیلا کر گالوں کو سرخ کر لیا۔سعید دھڑ سے دروازہ کھول کر اندر گھس آیا تو میں ایک دم ٹھٹک گئی۔اس نے مجھے دیکھ کرنا گواری سے کہا''تم واقعی اس حلیئے میں اسکول جاؤ گی؟''

ہماری کلاس میں کل تیس لڑکیاں تھیں۔میں،میری سہیلیاں ہند اور طرفہ پیچھے بیٹھتے تھے۔ہم اپنی خاص چیزیں اپنے ڈیسک کے اندر عبائے میں چھپا کر رکھتے تھے،یہ عبائے ہم گھر جاتے وقت باقاعدگی سے پہنتے تھے۔ہند ویڈیو ٹیپ لاتی تھی۔کبھی کبھی طرفہ باہر کے فیشن میگزین لاتی تھی جس میں عورتوں کی تصاویر ہوتی تھیں،خوبصورت رنگ برنگے ملبوسات پہنے ہوئے۔بالکل ہمارے خوابوں کی طرح خوبصورت اور رنگا رنگ،جن خوابوں کی سرگوشیاں ہم رات کو چاند سے کیا کرتے تھے۔

ہم تینوں ایک ہی کتاب سے پڑھنے کے بہانے،کتاب کے پیچھے اپنے چہرے چھپائے ہوئے تھے۔اکثر ہم کتاب گھر بھول آنے کا بہانہ کیا کرتے تھے تاکہ کتاب ملکر پڑھنے کے بہانے باتیں کرسکیں۔ہماری انگلیاں کتاب کی آخری سطر پر تھیں اور سامنے کی قطار میں ایک لڑکی کھڑی سبق بہ آوازِ بلند پڑھ رہی تھی۔ہند نے مجھ سے پوچھا''فوٹو کہاں ہیں؟''

''سعید نے پھاڑ دئے۔''

طرفہ بولی،''کل رات جب میں فون پر بات کر رہی تھی عبداللہ میرے

کمرے میں آ گیا۔ میرے سر پر کھڑا ہو گیا، کمرے کے دو چکر لگائے پھر جھپٹا مار کر میرے ہاتھ سے فون چھین لیا اور اسے جب صرف دوسری طرف سے فون انگیج ہونے کی ٹون سنائی دی تو چلانے لگا ''کس سے بات کر رہی تھیں؟''

ہم نے سہم کر پوچھا ''اسے پتہ چل گیا؟''

اس سے پہلے کہ طرفہ ہمیں جواب دیتی استانی کی کرخت آواز آئی ''پیچھے کیا باتیں ہو رہی ہیں؟ اگر تم لوگ خاموش نہ ہوئیں تو سب کو الگ الگ بٹھا دوں گی۔''

ان میں سے کون سی آواز زیادہ دہلا دینے والی تھی، عبداللہ کی یا استانی کی؟......

ہمارے دل دھڑک رہے تھے، ہمارے خواب ہوا میں بکھر گئے، ڈر کے مارے برا حال تھا ''کیا اس کو پتہ چل گیا کہ وہ ایک لڑکے سے بات کر رہی تھی۔؟''

ہمارے سامنے کی قطاروں میں لڑکیاں کھڑی ہو گئیں تھیں۔ آگے کیا ہو رہا تھا؟ استانی کی آوازِ آئی ''کھڑی ہو جایئے!''

پہلی مانیٹر نے اگلی قطار کے ڈیسکوں پر اپنا لکڑی کا رولر مارتے ہوئے کہا۔ ''انسپکشن، معائنہ!''

یا اللہ معائنہ! یہ اسکول کی مانیٹرس اور ان کے اچانک معائنے کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ آج کا دن بھی کیسا ہے جو سعید سے شروع ہوا اور ختم ہو رہا ہے مانیٹرس کے معائنے پر؟ وہ اسکول کے بستوں کا ہر ہر کاغذ دیکھ رہی تھیں۔ میرے پاس آج کیا ہے؟ ''عریبین نائٹس'' میرے بستے میں رکھی تھی جو میں نے کچھ دیر پہلے نورا سے لی تھی۔ میرے کان جلنے لگے۔

''سب اپنے بستے نکالو'' صرف سامنے کی قطار کی اچھی اور ''نیک'' لڑکیاں بیٹھ گئیں۔ ہم ایسی لڑکیوں کو ''دوافیر'' کہتے تھے، کتابی کیڑے۔!

مرفت نے اپنا بستہ نکالا، ''عبایہ بھی نکالو!'' ایک اسکول مانیٹر نے اسکی کتابیں اور کاپیاں نکال کر ڈیسک پر پھینک دیں۔ ایک کتاب کھول کر صفحے پلٹ کر دیکھنے لگیں۔ ایک چھوٹا سا فوٹو نکل کر گر پڑا۔ فوٹو مرفت اور اس کے ابا کا تھا جو انھوں نے

اپنے وطن میں سمندر کے کنارے کھنچوایا تھا۔ اب تو بے چاری مرفت بس موسم گرما کی شدید تپش اور سستا سا کالا عبایہ ہی جانتی ہے جو اسکول سے نکلتے وقت اسے اپنے چھوٹے سے جسم پر ڈالنا پڑتا ہے۔ جب مانیٹر نے اسکا فوٹو پھاڑا تو مرفت رونے لگی۔
''اب ہم کبھی واپس وطن واپس نہیں جا سکیں گے، آپ میرا یہ فوٹو ہی چھوڑ دیتیں۔''

جب مانیٹر نے دوسری قطار کا معائنہ کرنا شروع کیا تو میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ عربین نائٹس کی شہرزاد مجھے بھی اپنے ساتھ غار ہی میں لے جائے گی، مجھے بھی لے ڈوبے گی۔ وہ ہر رات کوئی نئی عجیب وغریب کہانی شہریار بادشہ کو سنا کر اپنی گردن کٹنے سے بچالیتی ہے۔ یا اللہ! گھر جاؤں گی تو کون مجھے میرے گھر میں رہنے والے شہریار سے بچائے گا؟

'' ہوں! تو یہ آئینہ ہے آپ کے پاس، بہت خوب، میری حسن کی ملکہ'' مانیٹر کسی لڑکی پر طنز کر رہی تھیں۔

لڑکیاں ہنسنے لگیں۔ اسکول مانیٹر تیزی سے پیچھے کی قطار میں ہماری طرف بڑھیں۔ وہ ہماری طرف جنگلی بلی کی طرح دیکھ رہی تھیں۔ ٹیچر نے اپنا رولر دو بار زور زور سے میز پر مار کر لڑکیوں کو تمیز سے رہنے اور خاموش رہنے کو کہا۔ لڑکیوں نے اپنی ہنسی مشکل سے روکی۔ ایک لڑکی اپنے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے ہنسی روکنے کی کوشش میں ہلے جا رہی تھی۔

میں نے اپنے ڈیسک میں بستے کے نیچے ہاتھ ڈالا کہ وہ کتاب نکال لوں، یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں کتاب ہاتھ سے پھسل کر نیچے نہ گر جائے ورنہ آفت آجائے گی۔

'' ماشا اللہ! تمہارے پاس رنگین میگزین ہیں۔ اتنی دیدہ دلیری!'' میئ سے پوچھ گچھ ہو رہی تھی۔

ایک مانیٹر نے دوسری مانیٹر کی طرف مڑ کر دیکھا اور میگزین اسے پکڑا دئے جو اس نے الگ رکھ دئے۔

''کل اپنی ماں کو لے کر آنا!''

''میری ماں گھر میں نہیں ہیں، صرف سوتیلی ماں ہیں۔ اور انھیں تو سنہرا موقع مل جائے گا کہ میرے ابا سے کہہ کر مجھے اسکول سے اٹھالیں۔'' ہیئی نے جواب دیا۔

مجھے پتہ تھا کہ سعید میری ماں پر چلائے گا، جیسے میرے ابا ایک بار چلائے تھے۔ ''میں اس گھر میں نہیں رکوں گا۔ تمہاری یہ بیٹی مجھے کہیں کا نہیں رکھے گی۔ یہ جو اسکول ہے سوائے گستاخی کے اسے اور کچھ نہیں سکھاتا''۔

''چپ رہو!'' مانیٹر نے میئی کو ڈانٹا جو رو رہی تھی۔ جیسے ہی مانیٹر میری والی قطار کی طرف بڑھی میرے گھٹنے لرزنے لگے، حلق خشک ہو گیا اور ایک بار پھر میں نے اپنے ڈیسک میں رکھے بستے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''یہ کس کے فوٹو ہیں'' ایک اور لڑکی سے تفتیش ہو رہی تھی۔

''میری بہن کی شادی کے۔''

''تمہاری بہن کی شادی سے اسکول کا کیا واسطہ؟ یہ کیا بے ہودگی ہے۔'' اور نھوں نے وہ البم میز پر رکھ دیا۔ دوسری اسے اٹھا کر ٹیچر کے پاس لے گئی اور دونوں نے مسکرا مسکرا کر تصویریں دیکھنی شروع کر دیں۔

میری ماں اپنا سر پیٹ لے گی، کہے گی ''میرے بارے میں لوگ باتیں بنائیں گے۔ کہیں گے کہ یہ ہی تربیت ماں نے دی ہے۔''

''کھڑی ہو جاؤ!''

''جی مانیٹر۔''

''اپنی کتابیں نکالو بستے سے، عبایہ بھی اور......''

میں نے بستہ کھولا اور عبائے کی تہہ کھولی۔ مانیٹر نے کتابیں لینے کے لئے ہاتھ بڑھائے۔ کتابیں نکل آئیں اور اس کے ساتھ جیسے شہریار کی تلوار بھی سر پر لٹکنے لگی۔ میرا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ایک بار نگاہ اٹھائی پھر سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔

☆☆☆

خوشی اور غم کے آنسو

جمیلہ فطانی

یونیورسٹی کا بڑا سا ہال خوشیوں سے معمور تھا۔ خواتین قطار در قطار بیٹھی ہوئی تھیں، مسکراتے چہرے، پرشوق نگاہیں۔ ایئر کنڈیشن کی ٹھنڈی پرکیف ہوا۔ اسٹیج پر لڑکیاں فخر سے یونیفارم پہنے بیٹھی ہوئی بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے چڑیوں کے جھنڈ ہوں یا موسم بہار کے پھول۔

پہلی قطار میں بیٹھی ہوئی ایک خاتون نے دوسری عورت سے پُرمسرت سرگوشی کی۔

"میری بیٹی احلام کا آج گریجویشن ہے۔ اس کا نام اناؤنس کیا جائے گا اور وہ اپنی کلاس کی ساتھیوں کے ساتھ جلوس میں چلے گی۔ یا اللہ! تیرا شکر، تو نے مجھے ناامید نہیں کیا۔"

"مبارک ہو!" اس عورت نے جواب دیا۔ "اللہ اس کو ہر کامیابی دے۔ میری بھانجی کا بھی آج گریجویشن ہے۔ وہ میری بیٹی کی طرح ہی ہے۔ اس کی ماں میری بہن تھی۔ اس کے انتقال کے بعد اسے اور اس کے بھائیوں کو میں نے ہی پالا ہے۔ اللہ اس پر کرم کرے۔ یہ میرے لئے سب سے زیادہ خوشی کا موقع ہے، آج اسکو شاندار تقریب میں دیکھوں گی۔"

احلام جو اپنی کلاس کی ساتھیوں کیساتھ انتظار کر رہی تھی، اس نے اپنے ارد گرد موجود چہروں کا جائزہ لیا۔ کیا وہ سوزان ہے؟ وہ خاموش طبع اور سنجیدہ لڑکی؟ آج پہلی بار یہ کتنی کھلی کھلی لگ رہی ہے۔ اور کیا وہ عفاف ہے؟ کتنی مست لگ رہی ہے،

خوب انجوائے کر رہی ہے۔

قریب بیٹھی ہدیٰ نے ایک کاغذ دیکھتے ہوئے کہا،

''دیکھو، یہ میرا نام لکھا ہے۔ اللہ کا شکر ہے، اس سے پہلے کبھی میرا نام صحیح نہیں لکھا گیا۔ ہمیشہ میرے خاندانی نام (sur name) میں کسی حرف یا نقطے کا اضافہ ضرور ہو جایا کرتا تھا، لوگ بہت مہربان ہو گئے ہیں۔ مگر آج کے دن مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا چاہے وہ میرے نام کی ہجے غلط لکھیں یا صحیح۔ یہ ہی کافی ہے کہ سب کو معلوم ہے کہ میں پاس ہو گئی، الحمداللہ!

احلام اپنی کلاس کی ساتھیوں کے چہروں کا جائزہ لیتی رہی۔ ''کیا یہ سب بھی اتنی ہی خوش ہیں جتنی میں ہوں؟'' اس نے خود سے پوچھا ''کیا یہ سب بھی وہی سوچ رہی ہیں جو میں سوچ رہی ہوں؟ اس خوشی کے لمحے تک پہنچنے کے لئے ان سب کو بھی میری ہی طرح مشکلات پیش آئی تھیں؟''

نظامت کرنے والی خاتون کی آواز مہمانوں اور طالبات کی سرگوشیوں پر چھا گئی۔

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' اس نے اعلان شروع کیا اور درود شریف کے بعد کہا ''اس اللہ کی تعریف کے ساتھ جس نے ہمیں ہدایت دی اور علم اور عقل سے نوازا۔''

پورے ہال پر خاموشی چھا گئی۔ وہ لمحہ آ گیا تھا جس کا سب کو انتظار تھا، تقریب شروع ہو گئی۔ خطبات پیش کئے گئے، خواتین پر جوش انداز میں تالیاں بجا رہی تھیں۔ سامعین میں بیٹھی ہوئی ہر عورت یہ محسوس کر رہی تھی کہ جیسے اسکی ہزاروں بہنیں اور بیٹیاں اس کے گلے لگ کر مبارک باد پانے کی منتظر ہیں۔ ''اللہ تمھیں ہر کامیابی عطا کرے۔''

احلام نے مجمع پر نظر ڈالی، اور اسے بھی ایسا لگا کہ وہ سب اسکی عزت افزائی کے لئے آئی ہیں اور اسکو گلے لگا کر مبارک باد دینا چاہتی ہیں۔

ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے ساری دنیا اسکی کامیابی کا جشن منا رہی ہے۔ اپنے نام

اور ڈویژن کے اعلان کے انتظار میں اسکا پورا جسم کانپ رہا تھا۔

بہت دن پہلے بھی اسے ایسا ہی احساس ہوا تھا۔مگر نہیں، وہ مختلف تھا۔ جب وہ گیارہ سال کی تھی اور ریڈیو پر اپنے ایلمنٹری اسکول کے نتیجے کے اعلان کی منتظر تھی۔شوق اور امید سے دل معمور تھا.........مگر صرف نتیجے سے ایک دن پہلے اسکے والد نے اسکی والدہ سے کہا تھا،

''سنو! احلام کے لئے یہ سارٹیفکٹ بس کافی ہے۔اب آگے تعلیم کی ضرورت نہیں ہے۔اسے چاہئے کہ گھر کا کام کاج سیکھے،تمہاری مدد کرے اور ہمیں اسکول کے بکھیڑوں سے دور رہنے دے۔''

کسے معلوم تھا کہ والد کا فیصلہ ایسے خوش آئند خوابوں اور خوبصورت توقعات کو چُور چُور کردے گا؟ احلام کا شوق، عزم و حوصلے متزلزل ہو گئے۔ احلام نے اپنی استانیوں،ساتھیوں اور پرنسپل کی ہمت افزائی سے خود کو دریافت کیا تھا۔اپنے کتابوں کے شوق، اور اپنے نام سے جو کلاس کے نمبروں کی لسٹ میں سب سے پہلا ہوتا تھا احلام نے اپنی پہچان بنائی تھی۔احلام سعید کلاس میں اول نمبر پر تھی۔وہ خود کو اپنی ماں کی دعاؤں کے حوالے سے پہچانتی تھی،وہ دعائیں جن میں تمنا تھی کہ میری بیٹی تعلیم مکمل کر کے ایک بڑی پروفیسر بنے۔اسکول سے الگ ہو کر بھلا اسکی پہچان ہی کیا تھی؟

اس کی ماں اور خالہ نے اسکے والد کو قائل کرنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ سب جو اس کے روشن مستقبل کی امید رکھتے تھے،دل برداشتہ ہو گئے۔سب خواب اور توقعات ڈھیر ہو گئیں۔اس کے والد نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔جب اس کے نام کا اعلان ہوا تو اسکی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے،تکلیف اور غم کے آنسو۔

احلام نے پانچ سال یوں ہی گذار دئے،بغیر کسی تعلیمی کورس کے جو اس کے ذہن رسا کو دعوت دے،بغیر کسی کلاس کی ساتھی کے،بغیر کسی امتحان اور نتیجے کے انتظار کے۔مگر پھر بھی وہ جو بھی ہاتھ لگتا پڑھتی اور اس کے بارے میں سوچتی۔ وہ اپنے

چھوٹے بہن بھائیوں کے ہوم ورک کی نگرانی کرتی، وہ چاہے کتنا ہی اسکول کے کام سے جان چرائیں وہ جی جان سے پڑھائی میں ان کی مدد کرتی۔ اس نے اپنے بھائی کی کتابیں پڑھ ڈالیں، نظمیں یاد کرلیں، اسلامی فقہ پڑھا۔ جب بھی اس کے کسی بھائی کو حساب کے سوالوں یا تھیوری میں مشکل پیش آتی وہ خوشی خوشی الجبرا اور calculus کے سوال حل کر دیتی۔ وہ اپنے رشتے داروں اور پڑوسیوں سے اسکول اور پڑھائی کی باتیں کرتی رہتی تھی تا کہ خود کو کلاس روم، استانیوں اور کلاس کی ساتھیوں کے کچھ قریب محسوس کر سکے۔ اس کے ارد گرد رہنے والے حیران تھے کہ یہ سب کیسے ہوتا ہے۔

ان پانچ سالوں میں وہ تعلیمی دنیا کو نہیں بھولی، وہ دنیا جس کی اس کو چاہت تھی۔ حالانکہ جب بھی ہر سال نتیجوں کا اعلان ہوتا تو اس کا دکھ اور گہرا ہو جاتا تھا۔ وہ اس محرومی کی سخت اذیت میں رہتی تھی۔ وقت گذرا جا رہا تھا اور وہ ایک تاریک گوشے میں بیٹھی اپنی اداسی میں گم تھی۔ مگر وہ اپنے والد کے سامنے سر اٹھا کر ان کی سخت گیری کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں رکھتی تھی۔

''پلیز! اماں'' وہ اپنی ماں سے التجا کرتی ''پلیز، ان سے کہئے کہ مجھے ایک اور موقع دے دیں۔ میں اسکول کب واپس جا سکوں گی؟ میں اس ارمان میں مری جا رہی ہوں۔ ہر کوئی وقت کے ساتھ دوڑ رہا ہے علاوہ میرے۔ میں جسے کوئی امید نہیں سوائے اللہ کی رحمت کے جو مجھے پھر تعلیم کی طرف بھیج دے گی۔ میں بھی دوسروں کی طرح زندگی کی تازگی محسوس کر سکوں گی۔ اماں پلیز۔''

''میری پیاری بچی، کاش میں یہ کر سکتی۔ کئی بار میں نے کوشش کی مگر کچھ نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ انھوں نے مجھے اس موضوع پر گفتگو تک کرنے کے لئے منع کر دیا۔ تم سمجھتی ہو نا؟ ان کا خیال ہے کہ لڑکیوں کو ڈگریوں کی ضرورت نہیں ہے۔ انھیں تو وہ کام سیکھنے چاہئیں جو شادی کے بعد ان کے کام آئیں۔ یہ میں تم کو کئی بار بتا چکی ہوں۔''

''تو پھر ٹھیک ہے، میں خود ان سے بات کروں گی، ہاں! آج ہی۔ میں اب اور یوں ہی خاموش نہیں بیٹھی رہ سکتی۔ مجھے معلوم ہونا چاہئے کہ وہ کیا سوچتے ہیں،

کیوں انھوں نے یہ غیر منصفانہ فیصلہ کیا ہے۔ اماں! میں ان کو قائل کرلوں گی۔ انشااللہ میں واپس اسکول جاؤں گی۔"

اس نے اپنے گالوں پر بہتے ہوئے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "یا اللہ! میری مدد کر۔"

"شام بخیر، بابا۔ کیا میں بیٹھ سکتی ہوں؟ میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتی ہوں۔"

اس نے یہ الفاظ ان کے چہرے کی طرف دیکھ کر بہت حیران کن اعتماد کے ساتھ کہے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ اپنے والد کا سامنا کر سکتی ہے، اس نے کبھی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ اس کے کسی بھی بھائی بہن نے آج تک ان سے بات نہیں کی تھی۔ بس اماں کے ہی وسیلے سے بات ہوتی تھی۔ ان کی سخت گیری مشہور تھی۔

"شام بخیر احلام! بیٹھ جاؤ، تم اسکول واپس جانے کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہو۔ میں نے تھوڑی دیر پہلے تمہاری ماں کے ساتھ گفتگو سن لی ہے۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

"جی ہاں بابا! مجھے امید ہے کہ آپ مجھے بتائیں گے کہ آپ کیوں مجھے پڑھانا نہیں چاہتے۔ اسکول جانے سے مجھے باقاعدہ کچھ سیکھنے کا موقع ملے گا۔ اس سے مجھے پڑھ لکھے لوگوں سے ملنے کا موقع ملے گا، مختلف قسم کے لوگوں کا تجربہ ہوگا۔ تعلیم ایک اسلامی فریضہ ہے۔ علم بہت ضروری ہے اور اسکول علم پھیلانے کا بہترین وسیلہ بن گئے ہیں۔ بابا! میرا یقین کیجئے، اسکول تو نیکی کے دائرے ہیں۔ ہماری استانیاں ہماری ماؤں کی طرح ہیں، اور انتظامیہ کے لوگ ہمارے باپوں کی طرح ہیں جو اپنے شاگردوں کو دین ودنیا کے احسن طریقے سکھا کر رخصت کرتے ہیں۔"

"احلام میری بیٹی! تم جو کچھ کہہ رہی ہو میں سمجھتا ہوں، مگر میں منتظر تھا کہ تم خود کہو، تمہاری طرف سے اس رویہ کا اظہار ہو۔ مجھے بھی اس بات کا اعتراف کرنا

چاہئے کہ میں نے غلطی کی کہ خود کو ایک سیپ کے خول میں بند کرلیا اور کھینچ کر تم کو بھی اپنے ساتھ بند کرلیا۔ میں نے سوچا تھا کہ سمندر کی گہرائیوں میں سیپ میں بند رہ کر تم تیز و تند موجوں سے محفوظ رہو گی۔ میں تمہاری حفاظت کرنا چاہتا تھا۔"

"بابا، کیا اب وقت نہیں آ گیا ہے کہ ہم اس خول سے نکلیں اور حقیقی دنیا کو دیکھیں.....اس کے سمندر اور اس کے ساحل؟"

"ہاں بیٹی، اب اس کا وقت آ گیا ہے۔ ہمیں کافی دیر ہو گئی ہے۔"

احلام کی یادوں کا سلسلہ اناونسر کی آواز سے ٹوٹا،

"احلام سعید منصور۔ آنرس گریڈ اور پہلی پوزیشن۔"

سارا ہال تالیوں کی آواز سے گونج اٹھا اور یہ آواز اسے یادوں کی دنیا سے حال میں لے آئی۔ جب وہ اپنا ڈپلوما لینے گئی تو اس نے سامنے بیٹھے لوگوں کی طرف دیکھا اور ایک شفیق آواز اس کے دل میں اتر گئی۔

"دیکھو بہن! وہ میری بیٹی ہے، احلام۔"

اسکی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ مگر اس بار یہ آنسو خوشی کے تھے۔

☆☆☆

میں اس جیسی کیوں نہیں ہوں

جمیلہ فطانی

منیرہ نے ہولے سے سرگوشی کی، چڑیا کی طرح جو میٹھے گیت فضا میں بکھیر دیتی ہے۔

"اے دلال! تم میرا کھانا کھاؤ گی؟ آؤ! دونوں مل کر کھاتے ہیں، آؤ! دونوں مل کر کھائیں گے پھر کھیلیں گے۔ میں تو ہمیشہ تمہارے ساتھ ہر چیز بانٹنا چاہتی ہوں۔تم اچھا لگے گا نا؟"

دلال نے صرف سر ہلا کر چاروں طرف دیکھا، ڈر کے مارے اسکی جان نکلی جارہی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر کے آنسوؤں کی برکھا کو روکا ورنہ اسکی بہن بہت آزردہ ہوجاتی۔صرف منیرہ ہی اس کے لئے ہمدردی کا آسرا تھی۔ جب بھی دونوں کی نگاہیں ملتیں یا جب کبھی امّ منیرہ (منیرہ کی ماں) کی نظروں سے دور دونوں کو کچھ دیر کا ساتھ مل جاتا، یہ ہمدردی اسکے وجود کو ڈھانپ لیتی۔ وہ دونوں دور بھی ہوتیں تب بھی یکجان ہوتی تھیں۔

مگر ناانصافی کا کرب، بارہ سالہ دلال کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ان میں سے بیشتر سال اس نے اپنے خوش وخرم گھونسلے میں گذارے تھے جو اسکی اور اسکی ماں کی پناہ گاہ تھا۔ ہاں، وہ اپنے باپ کا پیار بھی یاد کرتی تھی جو آٹھ سال پہلے اسکو چھوڑ کر چل دیا تھا، مگر وہ اپنی ماں کے پروں کی گرماہٹ میں مگن رہی اور جب خود اپنے پروں پر اڑنا سیکھا تو آزادی کا مزہ بھی چکھا۔اس کی ماں نے اسے محبت سے پروان چڑھایا تھا۔

مگر وہ آنسو کبھی نہیں بھول سکتی جس نے خوشیوں کا خاتمہ کر دیا۔ وہ دکھ بھری نگاہیں جن میں سوال ہی سوال تھے جواب کوئی نہ تھا۔

ہمیں کیوں جدا ہونا پڑا؟ ہم پھر کب ملیں گے؟ ہم ایک دوسرے سے دور کیسے رہیں گے؟ کیا میرا باپ مجھے اس رستے پر دانے بکھیرتے جانے کی اجازت دے گا تا کہ ان کی مدد سے میں واپس اپنے گھونسلے کا راستہ ڈھونڈ سکوں؟ یا ہوا اس راہ کے سب نشان مٹا دے گی؟ اے میری اماں! اے اماں!

دلال نے اپنے ہاتھ پر منیرہ کے ہاتھ کا لمس محسوس کیا اور اس کی پیار بھری التجا سنی،

''دلال، میرے ساتھ کھانا کھا لو۔ مجھ سے اپنے دل کی بات نہیں کہنا چاہتیں، بولو؟''

دلال نے اداسی سے کہا،

''مگر جو ہم چاہتے ہیں کر کیسے سکتے ہیں؟ اگر تمہاری ماں کو ہمارے خوابوں کی بھنک بھی پڑ گئی تو وہ ان کو پیدا ہونے سے پہلے ہی مار ڈالیں گی۔ شاید تمھیں خواب دیکھنے کی اجازت ہو مگر تمہاری ماں مجھے یہ حق نہیں دیتیں۔ اگر میں خواب دیکھنے کی ہمت بھی کروں تو وہ میرے پر کتر دیں گی، میرے پنجے توڑ دیں گی۔''

''تم فکر مت کرو'' منیرہ نے کہا ''وہ اپنے کمرے میں سو رہی ہیں، میں نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے۔ مجھے پتہ ہے میں بہت جرأت کر رہی ہوں، تم فکر مت کرو، میں سارا الزام اپنے سر لے لوں گی کہ میں ہی کچن سے کھانا لائی ہوں، تم نہیں۔''

منیرہ دلال کو اپنے کمرے میں لے گئی۔ دونوں لڑکیوں کے کمرے کتنے مختلف تھے۔ منیرہ ہمیشہ سے اس کمرے میں رہ رہی ہے وہ اسکی عادی تھی مگر دلال کو یہ کمرہ شدت سے ایک اور دنیا کی یاد دلا رہا تھا۔ اسٹور روم کا وہ کونا نہیں جہاں آج کل وہ سوتی ہے۔ اسے اپنی ماں کے گھر والا اپنا کمرہ یاد آ گیا۔ دونوں کمرے بالکل ایک جیسے ہی تو تھے۔ یہاں کی سفید قالین اسکے کمرے کی کتھئی رنگ کی قالین جیسی ہے،

یہاں کے لال پردے اسکے کمرے کے پھولدار پردوں جیسے، اور دیوار پر لگی ہوئی تصویریں.......۔ دلال نے دیوار پر لگی ہوئی تصویر کو بغور دیکھا جس سے شفقت اور محبت ٹپک رہی تھی......ایک درخت کی سرسبز شاخ پر ایک گھونسلے میں ایک چڑیا کا بچہ منہ کھولے ہوئے ہے اور اس کی ماں اپنی چونچ سے اسکے منہ میں دانہ ڈال رہی ہے۔ بالکل ایسی ہی تصویر، اسکی ماں کے گھر اسکے کمرے میں لگی تھی۔ ہاں، بالکل وہی تصویر۔ وہی رنگ، وہی برش، وہی آرٹسٹ، وہ ہی کاغذ اور ویسا ہی فریم اور یہاں تک کہ دیوار پر پردے سے تھوڑی دور بالکل اسی طرح سجی تھی۔

ایک بار پھر منیرہ کی آواز اسے حقیقت کی دنیا میں لے آئی تھی۔ منیرہ نے فرش پر اخبار بچھا کر کھانا لگا دیا تھا۔

اس نے آواز دی، ''دلال! آؤ، بیٹھ جاؤ''

اور دلال اس آواز پر یوں کھنچی چلی گئی جیسے پیاسی دھرتی پر بارش۔

''تم ہمارا اچھا کھچا کھانا نہیں کھاؤ گی جسطرح میری اماں تم کھلاتی ہیں۔ میں انہونی کر کے دکھاؤں گی، انھیں ہم دونوں کے ساتھ یکساں برتاؤ کرنا ہوگا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہم دونوں مل کر رہیں۔ میں ہر چیز میں تمھیں شامل کروں اور تم بھی ہر بات مجھ سے کہو۔ ہماری ہر چیز مشترک ہو، خوشیاں اور آنسو بھی۔''

دلال کانپ گئی، اور گلو گیر آواز میں کہا،

''نہیں منیرہ، میں نہیں چاہتی کہ تم میرے آنسو اور دکھ میں شریک ہو۔''

اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ سوتیلی ماں کے ظلم اور باپ کی بے توجہی نے اس بارہ سالہ بچی کی زندگی سے خوشیاں مٹا دی تھیں، صرف آنسو ہی اس کے ساتھی تھے۔

'' اے! دلال،'' منیرہ نے کہا'' یہ نوالے جو ہم ساتھ کھا رہے ہیں کتنے مزے دار ہیں۔ اگر ان کی جگہ درختوں کی پتے بھی ہوتے تو ان بھنے ہوئے تیتر بٹیر سے بہتر ہی لگتے جو میں تمہارے بغیر اپنے ماں باپ کے ساتھ کھاتی ہوں۔''

امّ منیرہ کی تیز آواز گھر میں گونجی۔

''کہاں ہو دلال! چلو کھانے کی میز لگاؤ، تمہارے بابا آ گئے۔''

دلال نے اخبار پر رکھا ہوا کھانا سمیٹا، وہ اپنی سوتیلی ماں کا حکم بجانے کے لئے اٹھنے ہی والی تھی مگر اٹھ نہ سکی۔ اس کا جسم خوف سے کانپ رہا تھا۔ اور جب اسکی سوتیلی ماں کی گالیاں اور مار اس کے کمزور جسم پر پڑنے لگیں تو وہ سانس بھی نہیں لے پائی۔

''تم اور تمہارا مکارپن! کھانا چرانے کے علاوہ اور کچھ نہیں سوجھا'' امّ منیرہ چیخی ''یا ابو منیرہ! منیرہ کے ابا، آؤ دیکھو تمہاری بیٹی نے کیا کیا۔ وہ اب چور بھی بن گئی ہے۔''

منیرہ نے دوڑ کر اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ لیا اور لرزتی ہوئی آواز میں بولی،

''نہیں ماما! میں ہی دونوں کیلئے کھانا لائی تھی۔ میری بہن چور نہیں ہے۔ اللہ کی قسم، میں تھی کھانا لانے والی۔ میں ہمیشہ اپنے کھانے میں اس کو شریک کرنا چاہتی تھی مگر کبھی آپ سے کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔''

اسکی ماں پھر دلال کو پیٹنے لگی اور چلائی ''تم نے میری بیٹی کو بیوقوف بنا لیا تاکہ سزا سے بچ جاؤ۔ تم نے چالاکی سے اس سے ہمارا کھانا منگوا لیا تاکہ تم چور نہ کہلاؤ۔ چور! جھوٹی!''

منیرہ ڈری ہوئی چڑیا کی طرح کانپ رہی تھی مگر ہمت کر کے بولی ''ماما! نہیں ماما! میں ہی تھی جو یہ کھانا لائی تھی، میں ہی لانا چاہتی تھی، میں ہی لائی تھی۔ آپ مجھ پر الزام کیوں نہیں لگاتیں؟ اگر یہ جرم ہے تو مجھے سزا دیجئے ماما! مجھے ایسے کیوں نہیں مارتیں جیسے اسکو مار رہی ہیں۔ مجھے اس کی جیسی اذیت کیوں نہیں دیتیں۔''

امِّ منیرہ کی حیرت زدہ نگاہیں اس کے باپ کی لاپرواہ نگاہوں سے ملیں جو اس وقت اک منٹ کے لئے دروازے پر رک کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ اور تیز آواز میں چیخی،

''یہ کیا ہے منیرہ۔ کیا تمہارا دماغ چل گیا ہے، خود اپنے لئے اذیت

مانگ رہی ہو۔''

''نہیں ماما!'' منیرہ نے کہا'' مگر میں اپنی بہن دلال سے محبت کرتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ انصاف کریں اور اپنے دل کی بھڑاس نکال لیں۔''

'' تم کیا بک رہی ہو میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ تم چاہتی ہو کہ میں تم کو اذیت دوں؟ اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے تمہارے پر کاٹ دوں، پنجے توڑ دوں یا اللہ! یہ میں کیا سن رہی ہوں؟''

منیرہ لڑکھڑاتی ہوئی دلال کی طرف گئی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا'' میں اب کبھی آپ کو دلال کی بے عزتی نہیں کرنے دوں گی، مارنے نہیں دوں گی۔ اسکے لئے میں سب کچھ برداشت کرلوں گی۔ آپ کو ہم دونوں کو مل جل کر رہنے دینا ہوگا۔ یہ میری بہن ہے۔''

'' مگر دلال کو تمیز سیکھنا چاہئے۔ اس کی پرورش ٹھیک سے نہیں ہوئی ہے۔ اسی لئے میں اسے سزا دیتی ہوں۔''

''نہیں ماما، یہ بات نہیں ہے۔ آپ اسے اس لئے اذیت نہیں دیتیں ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ کوئی اور چڑیا اسے آپ کے گھونسلے میں لائی ہے۔ اگر کہیں ایسا ہو کہ آندھی مجھے بھی کسی اور گھونسلے میں لے جا کر پھینک دے تو؟ آپ کو تکلیف نہیں ہوگی اگر کوئی چیل آپ کی بے چاری چڑیا کے پنجے توڑ دوے۔؟''

'' تم کیوں دخل دے رہی ہو، ان سب باتوں کا کیا فائدہ۔''

'' ماما، اگر کوئی چیل یا جنگلی بلی گھونسلے پر حملہ کرے تو چڑیوں کے قانون کے مطابق کوئی چڑیا اپنی بہن کو اکیلا نہیں چھوڑے گی۔ وہ ساتھ جئیں اور مریں گی۔ آپ کو کیسا لگے گا اگر کوئی چیل صرف مجھ پر حملہ کرے اور میری بہن مجھ کو اکیلا چھوڑ کر چل دے؟''

امّ منیرہ پلنگ پر بیٹھ گئی اور آنکھیں بند کرلیں، اور اپنے گالوں پر بہتے ہوئے آنسو پونچھنے لگی۔ پھر آنکھیں بند کئے کئے باہیں پھیلا دیں۔ آنکھیں کھولیں تو منیرہ

اور دلال اس کی گود میں تھیں۔اس نے دونوں کو لپٹا لیا اور بدبدائی،

''نہیں میری جان! تم کسی اور گھونسلے میں نہیں جاؤ گی، اور دلال تم، تم بھی میری چڑیا ہو۔تم جا کر اپنی ماں سے مل سکتی ہو، اور چاہو تو وہیں رہ سکتی ہو، ویسے یہاں بھی سکون و چین سے رہ سکتی ہو۔اگر تم یہاں رہنے کا فیصلہ کرتی ہو تو تم اور منیرہ دونوں ہر چیز میں حصہ دار ہوں گی۔کیا پتہ تمھیں منیرہ سے بھی زیادہ محبت یہاں ملے اور منیرہ تم سے جلنے لگے۔''

سب ہنس پڑے، منیرہ نے پیار سے اپنی بہن کی طرف دیکھ کر کہا، ''نہیں ماما، ہمیں صرف انصاف چاہئے اور آپ کے لئے دماغی سکون۔''

☆☆☆

زینب

شریفہ الشملان

زینب اپنے ساتھ اپنا سامان نہیں لے گئی تھی۔ وہ ہر چیز ویسے ہی چھوڑ گئی تھی۔ دو بجے دوپہر کو اس کا شوہر سوکر اٹھا تو اپنے کمرے کو بالکل اسی حال میں پایا جیسا کل تھا.... اسکی ایش ٹرے سگریٹوں سے بھری ہوئی، کافی کا خالی کپ، اسکے جوتے اور موزے وہیں پڑے تھے جہاں اس نے چھوڑے تھے، گھر میں خاموشی تیر رہی تھی۔

کسی کو پتہ نہیں تھا زینب کہاں ہے۔ اس نے زینب کے بارے میں اس کے میکے میں اور ساری دوستوں کے گھر جا کر پوچھا۔

''زینب تم کہاں ہو'' اس نے خود ہی سے سوال کیا۔ وہ اپنے آفس چلا گیا اور کوشش کی کہ اس بارے میں پریشان نہ ہو۔ حالانکہ صرف چند لمحوں کے لئے ہی، جب وہ اپنے کام میں بالکل غرق ہو گیا، یہ بات اسکے دماغ سے نکل پائی۔

اس کی ماں عبایہ پہن کر، سر پر اسکارف باندھ کر اپنے ڈرائیور کے ساتھ زینب کو ڈھونڈنے نکلی مگر ظاہر یہ کیا کہ جیسے یونہی ملنے جلنے نکلی ہے۔

زینب کی خالہ نے کہا'' میں نے شام اسے دیکھا تھا، اس نے کوئی خاص بات تو نہیں کہی تھی، مگر وہ اداس لگ رہی تھی۔''

زینب کی پھوپھی نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا'' ارے! میں تو اس سے دو ہفتے سے نہیں ملی، وہ شاید کسی کام میں مصروف ہوگی۔''

مرزی، اس کی پرانی آیا کو یاد آیا کہ اس نے زینب کو صبح اپنے بیٹے احمد کے

گھر دیکھا تھا جب وہ بھی وہاں گئی ہوئی تھی۔

احمد نے کہا'' وہ مجھ سے ملنے آئیں تھیں اور میں نے ان کو انکے اندورن شہر والے مکان کا کرایہ بھی پیش کیا تھا''۔

زینب گھر چھوڑ کر چلی گئی ہے، سب کو یقین ہو گیا۔

''اس کا پاسپورٹ دیکھو'' وہ وہیں موجود تھا۔

''اس کا آئی ڈی کارڈ ڈھونڈو'' مگر اس کا کوئی آئی ڈی کارڈ تھا ہی نہیں، اس کا نام اس کے شوہر کے آئی ڈی کارڈ میں ہی شامل تھا۔

اس کے سب سے بڑے بھائی نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ کر کہا ''جب وہ مل جائے گی تو میں اسے مار ڈالوں گا۔''

اس کا چھوٹا بھائی بڑبڑایا، ''مگر سب سے ضروری بات یہ ہے کہ اسے ڈھونڈا جائے۔''

اس کی سب سے چھوٹی بہن بہت خوف زدہ تھی۔

آخر کار اس کے شوہر کو پولیس کو فون کرنا ہی پڑا، پولس والوں نے وعدہ کیا کہ وہ خاموشی سے اس کو تلاش کریں گے۔

اس کی ماں نے غم وغصہ سے اپنا منہ پیٹتے ہوئے کہا'' میں اسے جانتی ہوں، ہمیشہ سے بے چین طبیعت کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے خود کو کچھ کرلیا ہے۔ کاش میں نے اسے پیدا ہی نہیں کیا ہوتا۔''

شوہر نے اپنے جوتوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا'' وہ منحوس دن تھا جب میں نے اس سے شادی کی تھی۔ وہ ملازمت کرنا چاہتی ہے، کس لئے؟ اور وہ کسی فلاحی تنظیم میں شامل ہونا چاہتی ہے، کیا یہ کافی نہیں کہ ہر مہینے کسی غریب کو پیسہ دے دیا جائے؟ ہمیشہ بے چین، غیر مطمئن....''

اس کی بوڑھی آیا نے ایکدم چلا کر اپنے بیٹے سے پوچھا'' اس نے تم سے کرایہ کی رقم کے بارے میں کچھ کہا تھا کہ اس کا کیا کیا جائے''؟

وہ فرش کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ''نہیں''، وہ سب کو نہیں بتانا چاہتا تھا کہ زینب نے اس سے کہا تھا کہ اس رقم سے وہ اپنے گھر کی مرمت کروالے اور باقی پیسے اپنے بال بچوں کے لئے رکھ لے۔

وہ سب اسے گھر گھر ڈھونڈنے میں سرگرداں تھے۔ وہ ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ زینب نے چاہے کچھ بھی کیا ہو مگر وہ ہرگز خاندان کی بدنامی کا باعث نہیں ہوسکتی۔

انھوں نے ایک ایک نوکر سے پوچھا۔

ڈرائیور نے کہا ''میں انھیں کہیں نہیں لے گیا''۔

بچوں کی آیا نے کہا ''انھوں نے بچوں کے کاموں کے بارے میں مجھ کو ہدایات دی تھیں مگر اس کے بعد میں نے ان کو نہیں دیکھا''۔

خادمہ نے کہا ''کل صبح انھوں نے مجھے سوریال دیئے تھے، اس کے بعد سے میں نے انھیں نہیں دیکھا''۔

باورچی نے کہا ''کل صبح میں نے انھیں ناشتہ دیا تھا، اس کے بعد سے میں نے انھیں نہیں دیکھا''۔

زینب آخر گئی کہاں، سب کو یہ ہی سوال پریشان کئے جا رہا تھا۔ اس کی ماں نے سر پر پٹی باندھ کر کسی پرانے دوست یا پڑوسی کا نام یاد کرنے کی کوشش کی جہاں زینب جا سکتی ہے۔

شوہر نے سوچا ''وہ ضرور اُس..... کے پاس ہوگی'' اس نے زور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک چھوٹی سی بچی نے منہ سے ببل گم کا غبارہ بناتے ہوئے دروازہ کھولا۔

''تم کون ہو بچی؟''

''جو اس گھر میں رہتے ہیں ان کی بچی''۔

''تمہارے والد کا کیا نام ہے؟''

بچی نے نام بتا دیا۔ اس نے اپنا ماتھا پیٹ لیا، وہ شخص تو شادی شدہ ہے، بچوں والا ہے۔ وہ تو زینب کو بھول بھی گیا ہوگا۔ چاہے زینب نے اسے نہ بھلایا ہو۔

یہ اسکینڈل اب گھر پر منڈلا رہا تھا۔ اس کی بہوؤں اور دامادوں تک یہ بات نہیں پہنچنی چاہیئے۔

اس کے چھوٹے بچے چہروں پر ماں کے اچانک غائب ہو جانے کا سوال لئے اسکول چلے گئے تھے۔

گھر گہری خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔

باورچی بڑے فریزر میں سے کچھ نکالنے کے لئے اسٹور روم میں داخل ہوا۔ زینب فریزر میں تھی۔ وہ برف کا مجسمہ بن چکی تھی۔

کس نے زینب پر فریزر کا ڈھکن بند کیا، یہ ایک الگ بات ہے۔

☆☆☆

ملازمت پیشہ ماں کے فرائض

وفا منور

آدھی رات ہو چکی ہے، اس گھر کے سارے لوگ گہری نیند سو رہے ہیں، سب کمروں میں اندھیرا ہے۔ سارے گھر پر خاموشی چھائی ہوئی ہے، سوائے دو کمروں کے۔ اس میں سے ایک میں اندھیرے کا بسیرا ہے مگر وہاں سے آتی ہوئی زوردار خراٹوں کی مستقل آواز پورے اپارٹمنٹ میں رات کی خاموشی میں خلل ڈال رہی ہے۔

لیلیٰ، خاتون خانہ، چار بچوں کی ماں، اپنے گھر کے فرائض اور اسکول ٹیچر ہونے کے فرائض کو نبھانے کی کی کوشش کرتی ہے۔ وہ یہ بات ماننے کو تیار نہیں ہے کہ یہ ذمہ داریاں اس کی برداشت سے باہر ہیں۔ اس کا خیال ہے کہ یہ فرائض اسے پورے کرنے ہی ہیں تاکہ اس کی گھریلو زندگی اور پیشہ وارنہ زندگی مستحکم اور خوشگوار رہے۔ اپنے نکاح کے معاہدے میں اس نے صرف یہ ہی شرط رکھی تھی کہ اسے اسکول میں پڑھانے دیا جائے گا۔ وہ اور محمود اس بات پر راضی ہو گئے تھے۔ تو اب وہ لاپرواہی نہیں کر سکتی، اسے خاتون خانہ کے اور استانی دونوں کے فرائض بہت ذمہ داری سے نبھانے ہیں۔ پھر بھی یہ طے ہوا تھا کہ جب کبھی اسے محسوس ہوا کہ وہ ملازمت جاری نہیں رکھ سکتی تو وہ فوراً کام چھوڑ دے گی اور گھر کی دیکھ بھال پر توجہ دے گی۔

وہ ابھی تک جاگ کر کل کے سبق تیار کر رہی ہے۔ دبیز رنگیں کاغذ کا پلندہ زمیں پر پڑا ہے، lesson plan ابھی کھلا ہوا ہے، کیونکہ اس نے ابھی تک سبق سے متعلق مثالیں نہیں لکھی ہیں ابھی کلاس کے لئے مذہبی objectives بھی لکھنے

باقی ہیں۔ زراعتی برآمدات کی مثالیں دینے کے لئے قریب ہی نائلون کی سات تھیلیوں میں بیج رکھے ہیں۔ ہرے کارڈ سوالات کے اور پیلے کارڈ جوابات کے تیار ہیں۔آخر کار کام ختم کر کے وہ کچن میں جاتی ہے تا کہ جو کھانا اس نے کل کے لئے پکایا ہے وہ فرج میں رکھدے۔سونے سے پہلے وہ الارم لگاتی ہے۔وہ اپنا تھکا ہوا جسم بستر کے سپرد کرتی ہے۔محمود اسی طرح خراٹے لے کر رات کی خاموشی میں خلل ڈال رہا ہے۔

لیلیٰ اسکول جلدی پہنچنا پسند کرتی ہے ،دیر سے جانا اسے پسند نہیں ہے، اسے کبھی دیر نہیں ہوئی۔وہ خوب سمجھتی ہے کہ محمود جب اسے اسکول چھوڑنے کیلئے ڈرائیو کر رہا ہوتا ہے تو اس کے دماغ میں کیا چل رہا ہوتا ہے۔وہ اس کے سوالوں سے بچنا چاہتی ہے،وہ اپنا چہرہ نقاب سے ڈھک لیتی ہے تا کہ اس کی آنکھیں کالے کپڑے کے پیچھے چھپ جائیں۔ابھی وقت نہیں آیا ہے کہ وہ ملازمت چھوڑ دے، ریٹائر ہو جائے۔وہ تھکی نہیں ہے،اس نے اپنا کیئریر بہت محنت سے بنایا ہے وہ اسے اب ترک نہیں کرسکتی۔

ٹریفک لائٹس کی وجہ انھیں دیر ہو رہی ہے۔جب بھی وہ دیر سے اٹھتا ہے تو ٹریفک لائٹس سو جاتی ہیں۔کسی طرح وہ بڑے بچوں کو اسکول پہنچا کر چھوٹے بچے کو نانی کے گھر چھوڑتے ہیں۔آج اسکی ہر کلاس میں نیا سبق شروع ہونا ہے،سوائے ایک جماعت کے جس کا آج ٹسٹ ہے۔وہ اس وقت میں ہوم ورک کی کاپیاں چیک کر لے گی۔وہ چاہ رہی تھی کہ اس سے پہلے کہ پرنسپل حاضری کا رجسٹر بند کرے وہ اسکول پہنچ جائے۔

اچانک ایک اور سرخ بتی۔۔۔پانچویں بار۔محمود زور سے بریک لگاتا ہے، وہ زور کا جھٹکا کھاتی ہے تو وہ ہنسنے لگتا ہے۔

’’تمہاری وجہ سے مجھے آج دیر ہوئی ہے، یہ کوئی ہنسنے کی بات ہے، میرا سر ونڈ شیلڈ سے ٹکراتے ٹکراتے بچا‘‘۔

’’سوری! ابھی پندرہ منٹ ہیں، تمھاری کلاس کی تیاری کیلئے کافی وقت ہے۔‘‘

لیلیٰ کے دماغ میں ایک آئیڈیا آتا ہے، جب وہ گھر واپس جائے گی تو سیدھی بستر پر جا کر تھوڑا سو لے گی۔ مگر وہ یہ کیسے کر سکتی ہے جب کہ استری کیلئے کپڑے پڑے ہیں، بچوں کا ہوم ورک دیکھنا ہے، شوہر کے کاموں کی دیکھ بھال کرنی ہے..... چھوٹے بچے کا رونا، اور امتحان کی کاپیاں چیک کرنا....

اس کی خود کلامی میں دخل دیتے ہوئے اس کا شوہر بولا ’’اب وقت نہیں آ گیا کہ تم ریٹائر ہو جاؤ اور آرام کرو ؟ اس سال کے آخر میں کام چھوڑ دینے کے بارے میں کیا خیال ہے؟‘‘

’’الحمدللہ! خدا کا شکر ہے! ہم اسکول پہنچ گئے۔ تمھیں جواب دینے کا وقت نہیں ہے..... یوں تو تم پہلے ہی جانتے ہو کہ میرا کیا جواب ہے‘‘۔ اس نے دل میں کہا۔

اسکول کے دفتر میں، طالب علموں کی کاپیاں سنبھالے لیلیٰ اپنی سپروائزر کو کہتے سن رہی ہے۔ ’’سبق سو فی صد کامیاب رہا۔ مضمون پر تمہاری گرفت اچھی ہے، تمہارا پڑھانے کا انداز دلچسپ ہے، تم نے طالب علموں کی توجہ برقرار رکھی۔ تمہاری teaching aids اپنے مقصد کو پورا کر رہی تھیں۔ مگر تمہاری آواز کچھ کم تھی، شاید کمرہ بڑا ہونے کی وجہ سے ؟ اللہ تمہاری کوششوں کو کامیابی کا تاج پہنائے۔ میں تمہاری ہیڈ مسٹرس کو مبارک باد دیتی ہوں کہ ان کے پاس تمہاری جیسی قابل استانی ہے‘‘۔

لیلیٰ دھیرے سے مسکرا کر بولی ’’آپ کی مہربانی کے لئے شکریہ۔ میں بس وہ ہی کر رہی ہوں جس کا مجھے شوق ہے، مجھے اس پر فخر ہوتا ہے‘‘۔

اب لیلیٰ اسٹاف روم جاتی ہے، جہاں وہ صبح سے پہلی بار کچھ دیر کے لئے بیٹھ

سکتی ہے۔اسکی کچھ ساتھی چائے پی رہی تھیں۔اسے دھیان آیا کہ اسکے ہاتھوں میں چاک لگی ہوئی ہے، وہ ہاتھ دھونے چلی جاتی ہے۔وہ چائے پینے بیٹھتی ہی ہے کہ اگلی کلاس کے لئے اسکول کی گھنٹی بج گئی۔وہ چائے پیتی رہتی ہے، اس کا یہ پیریڈ خالی ہے، بریک کا وقت۔مگر لگتا ہے کہ آج وہ ذرا بھی چین نہیں لے پائی گی..... کسی ٹیچر کو نزلہ ہوگیا تھا اور لیلیٰ کو اسکی جگہ پڑھانا تھا۔خیر کسی دن اسے بھی کسی ٹیچر کی اس قربانی کی ضرورت ہوسکتی ہے۔

گھر واپس جاتے ہوئے وہ بچوں کو لیتے ہیں۔گھر پہنچتے ہی لیلیٰ اپنا عبایہ فرش پر پھینک کر چھوٹے بچے کو پالنے میں لٹانے کے لئے بیڈروم کی طرف لپکتی ہے۔ دوسرا بیٹا بھوک سے چلاتا ہے، وہ جلدی سے لنچ کا انتظام کرنے لگتی ہے۔لانڈری روم سے گذرتے ہوئے وہ واشنگ مشین چلادیتی ہے۔

کھانے کے دوران فون بجتا ہے۔کوئی بھی فون اٹھانے کے لئے اپنی خدمت نہیں پیش کرتا، اور اس کیلئے بھی اسے ہی اٹھنا پڑتا ہے۔اچانک اس کا سب سے چھوٹا بچہ روتا ہے، وہ جلدی سے فون پر بات ختم کر کے، دودھ کی بوتل لیکر بیڈروم میں جاتی ہے۔اسے معلوم ہے کہ وہ بھوک سے جاگ گیا ہے۔محمود کھانا کھا چکا ہے اور فوراً ہی دن بھر کام کی تھکن کی وجہ سے سونے کے لئے چلا گیا ہے۔وہ بمشکل اخبار کی سرخیاں ہی پڑھ پاتا ہے، اخبار چہرے پر رکھے رکھے سو جاتا ہے۔

کچھ قریبی دوست شام کو مہمان آئیں گے، لہذا وہ ان کے آنے کی تیاری کرنے لگتی ہے۔وقت بہت جلدی گذر جاتا ہے، اذان ہوجاتی ہے۔

اسکا گھر مہمانوں سے بھرا ہوا ہے، ان سب کا خیال ہے کہ لیلیٰ کی شخصیت

بہت دلکش ہے..... بہت خوبصورت بیوی، بہت کامیاب، وہ اکیلے ہی اپنے گھر کو بخوبی سنبھالتی ہے..... قابلِ رشک ۔ لیلیٰ اپنے شوہر کی حسبِ معمول سوالیہ نگاہوں کو ڈھونڈتی ہے مگر وہ نظر نہیں آتیں شاید وہ اسکے عزم کو سمجھ گیا ہے..... رٹائرمنٹ کیلئے ''نہیں''۔

مہمانوں کے جانے کے بعد لیلیٰ اپارٹمنٹ کی صفائی کرنے کے بارے میں سوچتی ہے، پھر اسے خیال آتا ہے کہ اس کے بڑے بیٹے نے ہوم ورک نہیں کیا ہے، اور اس کے علاوہ اسے کل ڈینٹسٹ کے پاس بھی جانا ہے۔ جب ٹی وی اناونسر دوسرے دن ہونے والے پروگرام اناونس کر رہا تھا تو وہ سن کر چونک گئی کہ کل تو جمعرات ہے، ہفتے وار چھٹی کا پہلا دن۔ اس نے خوش ہو کر اطمینان کا سانس لیا۔ محمود نے اسکے کان میں دھیرے سے کہا،

'' مہمان کل واپس آ رہے ہیں، ہمارے ساتھ ویک اینڈ گذارنے کے لئے۔ تمھیں سپر مارکیٹ سے کچھ چاہئے؟''

وہ بڑی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہتی ہے،

'' اھلاً وسہلاً ،خوش آمدید۔ کچھ نہیں چاہیے، ہمارے پاس سب کچھ ہے۔ ڈیئر! جب تم سو رہے تھے میں نے سب انتظام کرلیا، میں نے پہلے ہی ان کیلئے اچھا سا کھانا تیار کرلیا ہے جو تم کو بھی پسند آئے گا۔ میں سمجھتی ہوں کہ اب یہ بات صاف ہے کہ ابھی میرے رٹائرمنٹ کا وقت نہیں آیا ہے۔ پکی بات؟''

'' پکی بات'' اس نے جواب دیا۔

☆☆☆

مکمل سکون

شریفہ الشملان

زیادہ تر مسافر سو رہے ہیں، فلائٹ بہت لمبی ہے مگر فاطمہ کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور ہے۔ اسکا چھوٹا بھائی برابر کی سیٹ پر سویا ہوا ہے۔ اسکے گھنے بال بکھرے ہوئے ہیں۔ بچپن میں کھیلتے ہوئے کتنی بار اس نے یہ بال کھینچے تھے۔ مگر اب احمد مرد بن گیا ہے۔ وہ ''مرد'' جس کی وجہ سے وہ اپنے اسکالرشپ پر امریکہ پڑھنے جانے جا رہی ہے۔ کیونکہ وہ اس کے ساتھ اس کا محرم بن کر جا رہا ہے۔ ''محرم'' وہ جو اسکی حفاظت اور دیکھ ریکھ کا ذمہ دار ہو، تبھی تو اسکو ایکزٹ ویزا مل سکا۔

''اسکی حفاظت اور دیکھ ریکھ''...... حالانکہ وہ جہاں پڑھنے جا رہی ہے احمد وہاں سے ہزاروں میل دور امریکہ کی کسی اور اسٹیٹ میں رہے گا۔ وہ تو چاہتی تھی کہ یہ چھوٹا بھائی اسکے ساتھ ہی رہے تا کہ وہ اسکی دیکھ بھال کر سکے، جب وہ گھر آئے تو صاف کپڑے اور قاعدے کا کھانا اسے مل جائے۔ وہ اسکے اسی طرح لاڈ کر سکے جیسے خدا بخشے ان کی ماں کرتی تھی۔ مگر اب وہ بچہ نہیں ہے، اسکو اپنی زندگی خود جینی ہے۔ وہ اندھیرے میں آپ ہی آپ مسکرائی۔ وہ اکثر بھول جاتی ہے کہ احمد اس کا محرم بن کر جا رہا ہے، وہ نہیں۔ وہ اکثر اس کو چھیڑتا ہے، ''فاطمہ لگتا ہے ان سے غلطی ہوگئی، تم کو میرا محرم ہونا چاہئے تھا، نہ کہ میں تمہارا محرم۔''

اسکی سیٹ والی قطار میں ایک جوڑا پیار بھری سرگوشیاں کر رہا ہے۔ شاید وہ اپنا ہنی مون منانے جا رہے ہیں یا شاید یہ دونوں بھی اسکالرشپ پر پڑھنے جا رہے ہوں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شوہر کو اسکالرشپ ملا ہو کیونکہ بہت سے نوجوانوں کے

لئے امریکہ کی کسی یونیورسٹی کا اسکالرشپ بیوی کو ساتھ لے جانے کا پرمٹ ہی ہوتا ہے۔ بعد میں کیا ہوگا اسکی کس کو فکر ہے۔

ہوائی جہاز تھوڑا سا ڈولتا ہے۔ فاطمہ اسکی عادی ہے، مگر نو بیاہتا جوڑا ڈر جاتا ہے اور وہ دعائیں پڑھنے لگتے ہیں۔ فاطمہ مسکراتی ہے۔

''براہوان Air pockets کا، جن سے انکے حسین لمحات میں خلل پڑ گیا۔'' وہ دل ہی دل میں کہتی ہے۔

اسکے بھائی کی آنکھ کھل جاتی ہے ''کیا وقت ہوا ہے؟''

''چار گھنٹے اور باقی ہیں۔ تم سوتے رہو۔''

وہ اپنی آنکھوں پر بانہہ رکھ کر پھر سو جاتا ہے۔

ایک چھوٹی سی بچی فاطمہ کے پاس آ کر ہاتھ بڑھا کر کہتی ہے ''ماما!''۔ اسکا دل دھڑک اٹھتا ہے، کتنا پیارا لفظ ہے۔ آج تک کسی نے اسے ماما کہہ کر نہیں پکارا تھا۔ پندرہ سال پہلے اسکی زبردستی کی شادی نے اسے ماں بننے کا موقع نہیں دیا تھا۔ فاطمہ اس بچی کو گود میں اٹھا لیتی ہے۔ مگر جب بچی دیکھتی ہے کہ وہ اس کی ماں نہیں ہے تو وہ اپنی ماں کو ڈھونڈتی ہوئی اس کی گود سے اتر کر چل دیتی ہے۔

ایک ائیر ہوسٹس پاس سے گذرتی ہوئی ایک عرب لباس پہنے ہوئے مرد کے پاس بے تکلفی سے بیٹھ گئی۔ وہ دونوں سر جوڑ کر بے حیائی سے سرگوشیاں کرنے لگتے ہیں۔ ''اونہہ! مجھے کیا ..... میں کیا خدائی فوجدار ہوں'' فاطمہ نے سوچا۔

اسے یاد آیا کہ اس نے اس شخص کو دہران ائیر پورٹ پر دیکھا تھا، وہاں بھی اسکی شکل کافی مانوس سی لگی تھی۔ کھچڑی داڑھی اور بالوں کے بغیر اس چہرے کا تصور کیا تو فاطمہ کو یاد آیا کہ یہ تو وہی ہے جو اپنی نوجوانی میں اسکی بڑی بہن کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے اسکے گھر کے باہر چکر لگایا کرتا تھا۔ ''ہوں! تو اب یہ بڑے ہو گئے اور داڑھی رکھ لی ہے'' فاطمہ نے دل میں کہا اور یہ سوچ کر وہ مسکرا دی کہ اگر

یہ میرا بہنوئی بن گیا ہوتا تو.....؟''

اس کو پیاس لگ رہی تھی ، وہ جہاز کے بار کی طرف جاتی ہے۔ وہاں تین آدمی کھڑے کاک ٹیل پی رہے ہیں۔ ''وہسکی کی بو کتنی بری ہے'' وہ سوچتی ہے۔ ''مگر مجھے اس سے کیا مطلب''۔ وہ پیپر کپ لے کر پانی انڈیلتی ہے۔ ان میں سے ایک مرد اسکی کمر میں ہاتھ ڈال دیتا ہے۔ وہ بغیر کسی گھبراہٹ کے پانی کا کپ اس کے سر پر انڈیل دیتی ہے۔ اس کے دوست ہنسنے لگتے ہے وہ کھسیا کر اپنا ہاتھ ہٹا لیتا ہے۔ فاطمہ کو یقین نہیں آتا کہ اس نے اتنے سکون اور ہمت سے کام لیا۔ وہ دوبارہ کپ میں پانی لے کر پیتی ہے اور اپنی سیٹ پر واپس آجاتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ پرسکون ہی رہے مگر اس کے دل میں آگ سی لگی ہوئی ہے۔ ''اگر مرد عورتوں کے مقابلے زیادہ عقل منداور دیندار ہوتے ہیں'' اس نے سوچا ''تو پھر شاید مرد اپنی مرضی سے ہی اللہ کی بخشی ہوئی یہ سب نعمتیں گنوا دیتے ہیں۔ زیادہ تر عورتوں کی ذہانت ان کے تجربات سے برتر ہوتی ہے جوان کے ایمان کو اور مستحکم اور مضبوط بنا دیتی ہے۔''

وہ مسکرانے کی کوشش کرتی ہے۔ ''ہاں! مرد مالک ہیں، سب کچھ ہیں۔ مجھے اچھا لگے یا نہ لگے۔''

فاطمہ وہ کتاب نکالتی ہے جو اس نے ائیر پورٹ پر خریدی تھی۔ '' کافی، چائے اور میں'' کتاب کے نام ہی سے پتہ چل رہا تھا کہ یوں ہی سی کتاب ہوگی۔ مگر وہ سفر کے دوران کوئی سنجیدہ چیز پڑھنا نہیں پسند کرتی تھی۔ وہ لائٹ جلا کر کتاب کے اوراق الٹ پلٹ کر مختلف ابواب کے عنوان اور کارٹون دیکھنے لگتی ہے۔ ایک باب کو عنوان ہے ''دوائیر ہوسٹس کی فضا میں فتوحات''

نہیں...وہ لائٹ بجھا دیتی ہے اور اپنے خیالوں میں کھو جاتی ہے۔

کل وہ ڈینور پہنچ جائے گی۔ اپنے بھائی کے ساتھ وہ ہوٹل میں ٹھیر جائے گی۔ ڈینور شہر سے وہ واقف ہے، اسکی سڑکوں، بلڈنگوں اور پارکوں کو جانتی ہے۔

اپنے کزن سے طلاق کے چار سال بعد اسنے یہیں آکر گریجویشن کیا تھا۔ وہ یہاں ایک گھر خرید لے گی۔ اس نے یونیورسٹی کے ہاسٹل میں رہنے کی کوشش کی تھی مگر وہاں رہنا ناقابل برداشت تھا۔ وہ ایک پرانی کار خرید لے گی.........نہیں....ہو سکا تو نئی کار... کیوں کہ اس کی گارنٹی ہوگی۔ لیکن اگر وہ کار خریدتی ہے تو ہوسکتا ہے کہ مکان نہ خرید سکے۔ مکان خریدنا زیادہ ضروری ہے۔ اس کو نہیں ٹالا جاسکتا کیونکہ یہاں پورے پانچ سال رہنا ہے۔ وہ مکان کا ڈاؤن پے منٹ دے دی گی، اور اس کے بعد ہر ماہ کی اتنی ہی قسط ادا کرنی ہوگی جتنا کسی مکان کا کرایہ جاتا۔ جب وہ اپنی ڈاکٹریٹ مکمل کرلے گی تو وہ مکان بیچ دے گی۔ تو یہ ایسا ہی لگے گا کہ اس کا کچھ خرچہ ہی نہیں ہوا۔ اور ہوسکتا ہے وہ اسمیں کچھ منافع بھی کمالے۔

تو نئی کار کی خریداری فی الحال ملتوی، حالانکہ امریکہ میں تو عورتیں کار چلاسکتی ہیں اور اس نے کار چلانا سیکھ بھی لی ہے۔ مگر.........فرنیچر، دوسری ضروریات؟ وہ رقم جو منسٹری آف ایجوکیشن سے ملی ہے، مکان کے ڈاؤن پے منٹ اور نئی کار دونوں کے لئے ناکافی ہے........فرنیچر کچھ ایسا بھی ضروری نہیں ہے۔ بس ایک بیڈ اور ایک کتابوں کی الماری کافی ہے، اسکے میک اپ کا سامان سوٹ کیس میں ہی رہ سکتا ہے۔ سب سے زیادہ اس کے لئے مکان اور کار ضروری ہے.......

اس کے خواب اس کے لبوں پر مسکراہٹ لے آئے اور آخر کار اس کی تھکی ہوئی آنکھوں کو راحت مل گئی۔

کسی نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا تو اس کا خواب ٹوٹ گیا۔ گھبرا کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ آدمی جس نے اسکی کمر میں ہاتھ ڈال دیا تھا کھڑا تھا۔ وہ ہکلایا۔ ''میں کچھ کہہ سکتا ہوں؟''

''کہئے'' اس نے کھردرے لہجے میں کہا۔

''پلیز! مجھے معاف کردیں، میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔''

''ٹھیک ہے کوئی بات نہیں۔''اس نے نارمل بننے کی کوشش کی۔

''کیا آپ مجھ سے ناراض ہیں؟''

''آپ اس حالت میں نہیں تھے کہ آپ پر غصہ کیا جاتا۔''

'' آپ کا مطلب ہے کہ میں نشے میں دُھت تھا'' اس نے پھر کہا ''میں معافی مانگتا ہوں، میں ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا۔''

''میں نے کہا نا، کوئی بات نہیں''اس نے بات ختم کرنی چاہی۔

''مگر میں اس کا یقین کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے مجھے معاف کر دیا ہے۔''

'' اللہ کی قسم، میں نے معاف کر دیا۔ بس خلاص۔''

''کیا میری باتوں سے آپ کو پریشانی ہو رہی ہے؟''

''نہیں، مگر میرا بھائی سو رہا ہے اور میں نہیں چاہتی کہ اسکی نیند میں خلل پڑے۔''

وہ تھوڑا پیچھے ہٹا اور اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا''اوہ سوری''اور چلا گیا۔

وہ طنزاً اپنے ہونٹ سکوڑ کر خود سے کہتی ہے''یہ ہیں شریف آدمی۔''

وہ دیکھتی ہے کہ دوسرا آدمی اور ائیر ہوسٹس ایک دوسرے میں گُم ہیں۔ اسے ایک واہیات سی فرنچ فلم یاد آ گئی جو اس نے تین سال پہلے دیکھی تھی۔ اس فلم کے بارے میں لوگوں سے سنا تھا تو خاص طور پر منگا کر دیکھی تھی۔ اس نے اس فلم کے سین حقیقت میں اپنے سامنے ڈھلتے ہوئے دیکھ کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ''کتنی بے حیائی کا مظاہرہ ہے''وہ سوچتی ہے،

''عین ممکن ہے کہ اس شخص کی بیوی ہو جس نے چلتے وقت اس کو عطر لگایا ہو، خدا حافظ کہا ہو۔ اور وہ شرابی آدمی، اسکی بھی شاید بیوی ہو گی جس سے اس نے شراب نہ پینے کا وعدہ کیا ہو۔ اگر بیویوں کو جادوئی ٹوپی مل جائے جس سے وہ

غائب ہوجائیں اور چھپ کر سب دیکھ لیں تو کیا ان کے گھر قائم رہ سکیں گے یا ڈھے جائیں گے'' وہ عقل اور دینداری کی نعمت کے لئے اللہ کا شکر ادا کرتی ہے۔

ہوائی جہاز زور سے ڈولنے لگا، برتن بکھر گئے، فاطمہ اور دوسرے سارے مسافر خوفزدہ ہو گئے۔ ائیر ہوسٹس کھڑی ہو کر مسافروں سے اپنی سیٹ پر حفاظتی بیلٹ باندھ کر سکون سے بیٹھنے کو کہہ رہیں تھیں۔ لائٹیں جل گئیں، مسلمان قرآن شریف کی چھوٹی سورتیں پڑھنے لگے، عیسائی سینے پر صلیب کا نشان بنانے لگے۔ فاطمہ نے خوف سے دھڑکتے ہوئے دل کے باوجود اسی شرابی آدمی کی طرف دیکھا، وہ ہوش میں تھا اور قرآن شریف کی سورتیں پڑھ رہا تھا اور وہ دوسرا آدمی، ائیر ہوسٹس سے عشق لڑانے والا بھی زیر لب دعائیں پڑھ رہا تھا۔ اسکے چہرے پر اب بھی لپ اسٹک کا نشان تھا، فاطمہ کی ہنسی نکل گئی۔ اگر جہاز کریش ہوتا ہے تو زیادہ تر مسافر گناہ کے نشانات لئے ہوئے مریں گے۔ فرشتوں کے لئے مردوں کا امتحان لینے میں آسانی ہوجائے گی۔

''یہ بھی کوئی ہنسنے کا وقت ہے، فاطمہ؟'' احمد نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔

''احمد! جو آدمی چوری نہیں کرتا وہ کبھی نہیں ڈرتا'' وہ ہنس کر کہتی ہے۔

ائیر ہوسٹسیں مسافروں کو تسلی دے رہی تھیں، معافی مانگ رہی تھیں'' کھانے کے لاکر کا دروازہ ٹھیک سے بند نہیں ہو پایا تھا وہ ہی کھل گیا اور برتن بکھر گئے۔ ہم مسافروں سے معذرت خواہ ہیں کہ ناشتہ نہیں پیش کرسکیں گے۔'' پھر وہ گری ہوئی پلیٹیں اور سامان اکٹھا کرنے لگیں۔

فاطمہ کو اپنی سیٹ کے نیچے سے ایک ناشتے کا بند پیکٹ مل گیا اس نے کھاتے ہوئے اللہ کا شکر ادا کیا۔ مسافر حفاظتی بیلٹ کھول رہے تھے، کچھ ادھر ادھر ٹہلنے لگے۔ بات چیت کی آوازیں بتدریج بلند ہونے لگیں۔

☆☆☆

نسوانیت کا جشن

نورہ الغامدی

جب سے میں نے ہوش سنبھالا یہ ہی سوچتی تھی کہ کاش میں مرد ہوتی ، یہ ہی میرا خواب تھا۔

جب کبھی اپنی الماری سے پہننے کے لئے مناسب لباس ڈھونڈ رہی ہوتی یا اس الجھن میں گھری ہوتی کہ کون سے جوتے زیادہ اچھے لگیں گے تو میرا دم گھٹنے لگتا۔

ایک الجھن سی میرے اندر کینسر کی طرح پھیل گئی تھی۔اگر ظاہری پیکر صرف سطحی ہوتا ہے تو ہم لوگ اپنی صورت شکل سے کیوں پرکھے جاتے ہیں، ہمارا اندرونی حسن کیوں نہیں دیکھا جاتا؟

اپنی اس اندرونی جھنجلاہٹ سے چھٹکارا پانے کے لئے میں نے اپنی تعلیم پر توجہ مرکوز کردی۔ان کتابوں پرتوجہ کی جن کی بنیاد پر میری شخصیت پرکھی جائے۔

کاش میں مرد ہوتی ! تو مجھے اس الجھن سے نجات مل جاتی۔بس میں اپنے لیکچرنوٹس پڑھتی،اپنے پڑھنے کے لئے نوٹس بناتی،آئینہ دیکھنے میں ذرا بھی وقت ضائع نہ کرتی۔اگر میں مرد ہوتی تو میں شاندار گاڑیوں میں سڑکوں پر اُڑی اُڑی پھرتی، اس بدبودار پیاز سے دور جو میرے ناخون خراب کر دیتی ہے،صابن کے اس جھاگ سے دور جو میرے ہاتھ خشک کر دیتا ہے۔چھٹکارا مل جاتا۔

اگر میں عورت نہ ہوتی تو سکون سے جیتی۔مجھے اپنے مستقبل کے اندیشے نہ ستاتے کہ جب میری شادی ہوگی تو مجھے اپنا گھر کو چھوڑ کر بالکل اجنبی جگہ جانا ہوگا۔ میں اسکول میں بھی چین سے رہتی اگر ان باتوں کا خوف نہ ہوتا جو ایک

عورت کے حوصلوں کو پست کر دیتی ہیں۔
ایک عورت ہو کر اگر میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرتی ہوں تو لوگ کہیں گے کہ میں بہت مغرور ہو گئی ہوں۔ اگر میں قابلیت کی باتیں کروں گی تو وہ کہیں گے کہ میں نفسیاتی الجھنوں میں مبتلا ہوں۔ اور اگر میں بس گھر میں بیٹھ جاؤں تو وہ کہیں گے کہ اس میں صلاحیت ہی نہیں تھی کہ اپنی تعلیم مکمل کر سکے۔

آخر کار میں اس بوجھ سے آزاد ہو گئی۔ کہا جاتا ہے نا ''دوسروں پر نظر ڈالو تو اپنی مشکلات ہلکی لگنے لگتی ہیں۔'' دیکھا کہ مردوں کی مشکلات کچھ اور بھی سنگین ہیں تو ''کاش کہ میں ....'' والا ذائقہ میری زبان سے غائب ہو گیا۔ لگتا ہے کہ دہی کے رائتے کے ساتھ میں اسے ہضم کر گئی۔
مجھے پہلی بار اس بات کا احساس تب ہوا جب میں بہت دیر سے آئینے کے سامنے ''کاش کہ میں .....'' والا ذائقہ ڈھونڈ رہی تھی۔ مگر اسکا کوئی نشان بھی نہ ملا۔ صریحاً اب اس خواہش نے میرا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ اب میں مرد ہونے کے لئے بے چین نہیں تھی۔ بلکہ میرے اندر کا وجود خوش تھا کہ میں مرد نہیں ہوں۔
آخر کار میں نے اپنی نسوانیت کا جشن منایا۔ اس بات کا جشن منایا کہ میں ایک کمزور مخلوق ہوں جس کے کاندھوں پر سخت زمین پر تاریخ کا خیمہ مضبوطی سے نصب کرنے کی ذمہ داری نہیں ہے۔ کوئی شعوری توجیہ مجھ پر دباؤ نہیں ڈالتی کہ سرخ پتھریلی زمین پر ہل چلا کر سرسبز تاریخ کی تمنا کروں جس میں سفیدی کی چمک ہو۔ میرے خوابوں میں یا ڈراؤنے خوابوں میں کوئی خون ٹپکاتی تلوار میرا پیچھا نہیں کرتی جس میں ربین، شمیرا اور ان سب کے خون کی بو ہو۔ عربی گھوڑوں کے ٹاپیں میری خوابگاہ کے دیواریں توڑ کر میری میٹھی نیند میں مخل نہیں ہوتیں۔
میں عورت ہوں، کانچ کی گڑیا!
میں کوئی کھردری بات برداشت نہیں کر سکتی۔ کوئی دکھ میرے مسام جان

میں نہیں اتر تا۔ یہاں تک کی اس زخمی فلسطینی لڑکے کا خون اس سڑک پر پڑا دیکھ کر جہاں سے وہ فوجیوں کو پتھر مار رہا تھا، مجھے کچھ کوئی دکھ نہیں ہوتا۔ مجھے اپنے خون کی بدلتی شکل کا احساس ہوتا ہے۔ نجد کی سردی میں جما ہوا میرا برف کے ٹکڑے جیسا خون اس سستے لوبان کی مہک میں بدل جاتا جو ہبرون، نابلس یا مسلم دنیا میں کہیں بھی دکھیاری ماؤں کی سسکیوں میں سلگتا ہے۔ مجھے اس سے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔

کتنی عمدہ بات ہے کہ میں مرد بن کر نہیں پیدا ہوئی۔ میرے دل میں اس خواہش نے کبھی جنم بھی کیسے لیا تھا؟ ایک مرد ہوتی تو کیسے اسطرح قسطوں میں مرنے کو برداشت کر سکتی، کیسے اس شکست کا سامنا کرتی۔

قابل تعظیم روایات مجھے ہتھیار اٹھانے سے روکتی ہیں، خودکش حملہ کرنے سے بچا لیتی ہیں۔ کیونکہ میں صرف ایک عورت ہوں، شیشے کی طرح نازک، مگر یہ ہی قابل تعظیم روایات مجھے میرے بچوں کے وسیلے سے اس جنگ میں شامل کر دیتی ہیں۔ میں بیٹے پیدا کرتی ہوں اور پھر اپنی مرضی سے انھیں جنگ کے سفید شعلے کی نذر کر دیتی ہوں۔ اچھا ہی ہے کہ عورتیں صعوبتیں اٹھانے کے لئے بہت نازک ہیں۔

مگر فی الحال، میں عورت ہوں کانچ کی طرح نازک اور جنگ میں بھیجنے کے لئے میرے پاس ابھی کوئی بچے نہیں ہیں، مجھے صرف رونے پر اکتفا کرنا پڑے گا۔ میں روؤں گی جب کبھی عورتوں اور بچوں کو زدوکوب ہوتے، مصیبتیں اٹھاتے، ظلم سہتے دیکھوں گی۔ اور اسکے بعد، میں بستر کی ریشمی چادر میں منہ چھپا کر اتنا روؤں گی کہ گرم آنسوؤں سے میرا چہرہ جلنے لگے، میری زلفیں پریشان ہو جائیں۔ نہیں میں اس لئے نہیں روؤں گی، اس لئے ہچکیاں نہیں لوں گی کہ میں عورت بن کر پیدا ہوئی ہوں، بلکہ اس لئے کہ مردوں! تم مرد بن کر پیدا ہوئے ہو۔ میں تمہارے لئے روؤں گی۔ اور پھر میں ظلم کے خلاف، انتفادہ کے بچوں کیلئے گانے گاؤں گی.......ان کے لئے جو ایک پتھر پھینکتے ہیں اور اس کے بعد دو پتھر۔

اک وطن آنکھوں میں جنم لیتا ہے

وہ اپنے پاؤں کی گرد جھاڑتا ہے
اور پانی کے سلطنت میں داخل ہوتا ہے
اور کسی اور افق میں جا نکلتا ہے
وہ ایک اور داستان لکھے گا
نیا صحیفہ لکھے گا۔

ایک وہ لڑکا ہے جس کی پیشانی پر فلسطین کے سارے رنگ چمکتے ہیں، اس کے بالوں میں ایک شاخ اٹک گئی ہے جب وہ زیتون جمع کر رہا تھا، وہ زیتون جو ہم گہری میٹھی نیند لے کر اٹھنے کے بعد ناشتے میں کھائیں گے۔ ایک اور لڑکا ہے جس کا خون میرے لئے آبِ حیات ہے۔ اور ایک تیسرا لڑکا ہے جو میرے پرانے خواب کی خوشبو ڈھونڈ لاتا ہے جو مجھے پھر سے گھیر لیتی ہے۔ کیا میں خواہش کروں کہ میں ایک لڑکا ہوتی تو ایک دو پتھر ہی پھینکتی، یا اپنی نسوانیت کا جشن منانے کے لئے اپنی شادی کے ہال کی روشنیاں جلائے رکھوں؟ بہت اچھا ہے کہ میں ایک عورت ہوں جو ایک بیٹا پیدا کرے گی جو صرف زبانی جمع خرچ نہیں کرے گا بلکہ نوک سناں سے بات کرے گا۔

☆☆☆

فاختہ ایک عورت ہے

نورہ الغامدی

بہت سی عورتیں سونے سے پہلے روتی ہیں۔ عورت کے لئے بہت مشکل ہے کہ وہ اس بات کا کسی سے گلہ کرے، ہر عورت سمجھتی ہے کہ صرف وہ ہی ہے جو رات کا اک پہر روتے ہوئے گذارتی ہے، ایک خوبصورت مگر مضمحل کر دینے والا عمل۔ اگر ان میں سے کوئی گلہ کرنا بھی چاہے تو کوئی بھی مرد چاہے وہ کتنا بھی حساس ہو، ہمدردی نہیں کرے گا اور نہ اس پر دھیان دے گا۔ عین ممکن ہے وہ یہ ہی کہے "یہ تو عورتوں کی عادت ہے، خاص کر جب ساری دنیا سو رہی ہوتی ہے تو ان کی جاگتی آنکھوں کے خواب ان کی تھکے ہوئے ذہن پر یلغار کر دیتے ہیں"۔

"سب عورتیں روتی ہیں، مگر کچھ عورتوں کے آنسوؤں کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں۔ یہ میٹھے پانی کے سرچشمے ابلنا بند ہو جاتے ہیں"۔ عورت کی تیز آواز کچھ گھٹ سی گئی "مجھے یہ ڈاکٹر نے بتایا تھا، اس نے کہا تھا کہ عورتوں کا رونا کوئی عجیب بات نہیں ہے، اگر وہ نہیں روتیں تو عجیب بات ہے۔"

میں اس کے قریب کھسک آئی "تو کیا ڈاکٹر نے رونے کی وجہ اور کتنے فی صد وقت رونا آتا ہے یہ معلوم کئے بغیر یہ سب کہا؟"

اس نے میری طرف مڑ کر کہا "کیا ہم رونے کو ناپ سکتے ہیں؟"

عورتوں سے بھرا ہوا کمرہ قہقہوں سے بھر گیا۔ ایک تیز آواز ابھری "رونے کا فی صد، ۷۵ فیصد ہے مگر میرے خیال میں یہ ڈاکٹر اس کا تعین کرنے کے سلسلے میں ناتجربہ کار لگتا ہے۔"

ہنسی اور زیادہ بلند ہوگئی۔ میں نے دلیری سے کہا ''ہاں! رونے کا بھی اندازہ فی صد میں ہوتا ہے، یہ ایک خاص تھیوری ہے، رونا ایک بیماری ہے اور اس کا لمبا علاج ہوتا ہے''۔

میرے قریب بیٹھی ہوئی عورت نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا ''اصل بات تو یہ ہے کہ رونا آتا ہے، اور دل سے ابلتا ہے۔ دل اک سمندر ہے جو خاموش آنکھوں کے ساحل کی طرف لہروں کو دھکیلتا ہے'' اس نے میری طرف دیکھا اور پوچھا ''کیا تم پہلی بار نفسیاتی ڈاکٹر کے پاس آئی ہو؟''

''ہاں پہلی بار''

''کیا پریشانی ہے؟''

''خوف، ڈراؤنے خواب اور رونے کی ایک عجیب سی خواہش۔ تمہارا کیا مسئلہ ہے؟''

''میری پریشانی بھی تم سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے سوائے ایک بات کے۔ ہر بار جب میں ڈاکٹر کے پاس آتی ہوں تو ایک خاص سوال پوچھتی ہوں جس کو سن کر وہ یا تو ہنسنے لگتا ہے، کبھی ٹیلی فون اٹھا کر کسی سے باتوں میں لگ جاتا ہے، کبھی وہ مجھے احمقانہ لطیفے سناتا ہے اور آخر میں مجھے مسکرانے کے لئے کہتا ہے۔ اس سے پہلے وہ مجھ سے دسویں بار پوچھتا ہے کہ میرا نام کیا ہے۔ دیکھو! دیکھو کونے میں جو عورت ہے وہ عجیب انداز سے روتی ہے۔ اور وہ جو لڑکی ہے نا، ایک منٹ میں دس بار اٹھتی ہے اور کھڑی ہوتی ہے''۔

''کلینک عورتوں سے بھرا ہوا ہے، اس کی بے چینی فطری ہے، مگر میں بور ہوگئی ہوں۔'' میں نے کہا ''بہت افسردہ ماحول ہے، اور ویسی ہی افسردہ اسپتال کی بوٗ ہے، میرا تو دم گھٹا جا رہا ہے''۔

''برداشت کرو، میں یہاں چار گھنٹے سے آئی ہوئی ہوں''۔

''اگر مجھے ایک اور گھنٹہ انتظار کرنا پڑا تو میں پاگل ہو جاؤں گی۔ میرا بیٹا گھر پر

میرا انتظار کررہا ہے۔ وہ بہت چھوٹا ہے اور اسے مجھ سے دور رہنے کا عادی نہیں ہے۔''

''اس کا باپ کہاں ہے؟''

''وہ کہیں اور ہے۔''

''تو کیا اسکا مطلب ہے کہ تم طلاق شدہ ہو؟''

''اب تقریباً دو سال ہو گئے۔''

''کیا دوسری شادی کرنے کا ارادہ ہے؟''

''ایک آدمی ہے جو مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے مگر مجھے ڈر ہے کہ میں اپنا بیٹا کھو دوں گی۔''

''اس آدمی سے تمہارے کس قسم کے تعلقات ہیں؟'' اس نے پوچھا ''منگنی ہو گئی ہے یا محبت ہے؟''

''دوسری بات سچ کے قریب ہے۔''

''ہا! ہا! ہا!''

اس کے اس طرح ہنسنے پر کئی عورتوں نے ناگواری ظاہر کی، ایک نے کہا ''لوگوں میں اب کچھ شرم نہیں رہ گئی ہے۔''

دوسری نے کہا ''شاید اسے دورہ پڑ گیا۔''

تیسری نے کہا ''واقعی یہ پاگل ہے۔''

چند کم عمر لڑکیاں اس کے ساتھ زور سے ہنسیں اور پھر سوجھ بوجھ والی پختہ کار عورتوں سمیت سارا گروپ ہنسی میں شامل ہو گیا۔ تین منٹ بعد سارا کمرہ خاموش تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے تیکھے ناک نقشے والے زرد چہرے کی طرف اٹھائے اور آنکھوں میں آئے آنسو پونچھے۔ وہ رہ رہ کر ہنستی رہی اور پھر میری طرف دیکھ کر کہا ''تم اسکی بات کا اعتبار کرتی ہو؟''

میں اس کا جواب دینے سے پہلے ایک منٹ ہچکچائی ''کبھی کبھی میں اس پر اعتبار بھی کرتی ہوں۔''

مجھے اپنے تذبذب پر کوفت ہو رہی تھی۔

''جب مجھے اس پر شک ہوتا ہے تو خود کو ملامت کرنے لگتی ہوں کہ میں اس سے شاید محبت نہیں کرتی ۔ میں اس پر اعتبار کرتی ہوں، جب رات کو میں اکیلی ہوتی ہوں اور خواب مجھے کہیں دور لے جاتے ہیں تب مجھے اس پر اعتبار ہوتا ہے۔ مگر جیسے ہی سورج نکل آتا ہے اور میری آنکھیں روشنی سے دوچار ہوتی ہے تو مجھے لگتا ہے کہ جو کچھ گذرا تھا وہ خواب سے زیادہ کچھ اور نہیں تھا۔ کبھی مجھے اس سے اتنی نفرت ہونے لگتی ہے کہ دل چاہتا ہے کہ میری یاداشت کھو جائے تاکہ وہ میرے خیالوں میں بھی کبھی نہ آئے۔ مگر تم مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہو، اور تم ہو کون؟''

''میں ....میں ....یہیں کی عورت ہوں'' اس نے کہا'' تمہاری ہی طرح میں نے بچپن سے سیکھا تھا کہ اک مرد عورت کیلئے سب کچھ ہوتا ہے، اور عورت اس کے بغیر کچھ بھی نہیں، وہ ہوا میں ایک تنکے کی طرح ہے۔ ہمارے گاؤں میں اک عام محاورہ ہے کہ عورت کے لئے شوہر ایک قذ ہے، تمھیں معلوم ہے قذ کیا ہوتا ہے۔ تیز ہواؤں کے چلنے سے جو ریت کے ٹیلے بن جاتے ہیں۔

''اور کیا ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بے چاری تم، کیا اس نے تم سے کہا ہے کہ وہ تم سے شادی کرے گا؟''

''نہیں۔''

''کیا اس نے اس قسم کا کوئی اشارہ کیا؟''

''نہیں، مگر مجھے یقین ہے کہ وہ کرے گا۔''

''تم نے اس سے پوچھا کیوں نہیں؟''

''میں یہ کبھی نہیں کروں گی۔''

''کیا یہ تمہارا کسی قسم کا فرضی اصول ہے؟''

''نہیں، یہ خودداری ہے۔''

''میں تم سے کہے دیتی ہوں، اکثر مرد جھوٹ بولتے ہیں۔'' پھر وہ بولی ''مگر

مرد جھوٹے کیوں ہوتے ہیں؟''

کسی نے ہم دونوں کے بیچ میں اپنا سر گھساتے ہوئے، دل گرفتہ آواز میں سرگوشی کی''فاختہ سے پوچھو۔''

میں نے اپنی ساتھی کے پاس سے اپنا سر تھوڑا سا کھسکا کر اس کیلئے جگہ بنائی۔ اس عورت نے اپنا الجھے بالوں والا سر ہلاتے ہوئے میری ساتھی کی طرف گھورتے ہوئے دہرایا''میں نے کہانا، فاختہ سے پوچھو۔''

''فاختہ،........فاختہ،۔کیا مطلب ہے تمہارا؟

اس نے چھت کی طرف منہ کر کے گانے کے کچھ بول گائے۔

تو'...تو'...تو'.....تو'.....تو'....

اوہ احمد عدوی

میری کنگھی واپس لا دو

میرے بیٹے کا کھلونا لوٹا دو

تو'...تو'.... تو'...تو'.....تو'....

تم مجھ سے اپنا سونا واپس لے لو

تو'...تو'...تو'.....تو'.....تو'....

اوہ احمد عدوی

میری کنگھی واپس لا دو۔

دھیمے سر میں اس کا یہ اداس گانا کمرے کے کونے میں ایک عورت کے سر پٹخنے کے ہنگامے اور شور کی وجہ سے یک لخت بند ہو گیا۔ عورتوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ ایک نرس بیچ میں پڑی، دوسری آئی، تیسری آئی۔ کچھ عورتیں باہر چلی گئیں کچھ اندر آئیں۔ میرے اور میری ساتھی، جس سے کچھ دیر پہلے ہی جان پہچان ہوئی تھی، اس کے درمیان وہ عجیب سا چہرہ پھر نمودار ہوا۔

میری ساتھی نے کہا'' لگتا ہے یہ پاگل ہے۔''

اس عجیب سی عورت نے دھیرے سے مڑ کر میری طرف متوحش انداز میں دیکھا اور بولی ''میں امّ الحمام ہوں، فاختہ کی ماں۔''

میں اٹھ کھڑی ہوئی اور ہکلاتے ہوئے کہا ''فاختہ........فاختہ؟''

میری ساتھی نے اپنے پرس میں ہاتھ ڈال کر کچھ گولیاں نکال کر اپنے منہ میں ڈال لیں۔

''تم میری اور دوسری عورتوں کی طرح بیمار ہو مگر اس سے چھٹکارا پانے کیلئے گولیاں کھانا صحیح نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

مگر لگتا تھا کہ اس نے میری بات نہیں سنی، ''آج سات سال ہو گئے'' اس نے کہا ''میں مختلف کلینکس میں جا کر ڈاکٹروں سے یہ سوال پوچھتی ہوں کہ مرد جھوٹ کیوں بولتے ہیں۔''

سرگوشیاں پھر سے شروع ہو گئیں تھیں۔

''میں نے تم سے کہا تو'' اس اجنبی عجیب سی عورت نے پھر کہا ''فاختہ سے پوچھو۔''

میری ساتھی مسکرائی، وہ منتظر تھی کہ میں اس عورت سے بحث کروں گی۔ مگر وہ عجیب سے چہرے والی پیچھے جا کر دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ کچھ لمحوں کے لئے اس کے خراٹے کمرے میں پھیل گئے۔ وہ جاگی اور خوفزدہ انداز میں چاروں طرف دیکھا اور پھر سو گئی۔

میں نے اپنی ساتھی کے قریب جھک کر کہا ''صرف مرد ہی جھوٹ نہیں بولتے، عورتیں بھی جھوٹ بولتی ہیں۔''

اس نے ہوا میں اپنے ہاتھ لہراتے ہوئے بہ آواز بلند کہا ''مگر مرد بیس سال کی عمر میں ٹوٹ نہیں جاتے، وہ پچاس سال کی عمر کے بعد بھی بوڑھے نہیں ہوتے۔ یہ مردوں کیساتھ نہیں ہوتا، صرف عورتیں روتی ہیں۔ میں بیس سال سے رو رہی ہوں۔ تم کو پتہ ہے کیوں؟ میں نے ایک مرد سے محبت کی تھی جتنی کرنی چاہئے تھی اس سے

کہیں زیادہ۔ میں نے اس پر اعتبار کیا تھا مگر اس کے بعد وہ طلوع صبح کے ساتھ ہواؤں میں اپنی تلوار لہراتا نکل گیا۔

اک بار پھر وہ الجھے الجھے بالوں والا سر ہم دونوں کے درمیان نمودار ہوا۔

''کیا اس نے فاختہ کی آواز نہیں سنی؟''

سوائے عورتوں کے اعصابی تنفس کی آواز کے کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ باہر مریضوں اور ڈاکٹروں کے قدموں کی آہٹ سنی جا سکتی تھی۔ اس عورت کا افسردہ گانا پھر سے شروع ہو گیا۔

تو'...تو'...تو'...تو'...تو'....

اوہ احمد عدوی

میری کنگھی واپس لا دو

میرے بیٹے کا کھلونا لوٹا دو

تو'...تو'.... تو'...تو'...تو'....

تم مجھ سے اپنا سونا واپس لے لو

تو'...تو'...تو'...تو'...تو'....

اوہ احمد عدوی

میری کنگھی واپس لا دو۔

میں نے ہمت کر کے پوچھا ''احمد عدوی کون ہے؟''

اس نے سر ہلایا اور اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا ''وہ فاختہ کا عاشق ہے۔''

''فاختہ، تمہارا مطلب ہے وہ چڑیا جو ہم درختوں پر دیکھتے ہیں۔''

اسنے اپنے سینے پر ہاتھ باندھ لئے اور کہا ''میں تم کو بتاتی ہوں۔ جب دنیا تخلیق ہوئی تھی اور سارے جاندار بول سکتے تھے، فاختہ کا ایک چاہنے والا تھا جس کا نام احمد عدوی تھا۔ فاختہ کا ایک چھوٹا سا بیٹا تھا خوبصورت پروں والا۔ وہ روز سورج کی

روشنی سے بنی ہوئی ایک کنگھی سے اس کے پروں میں کنگھا کرتی تھی۔ یہ کنگھی اسے بیٹے کی پیدائش کے دن ایک نجومی نے دی تھی اور کہا تھا کہ اس کو بہت حفاظت سے رکھے کیونکہ اس کنگھی سے اس کے بیٹے کی جان جڑی ہوئی ہے۔ فاختہ نے ایک پر کے نیچے یہ کنگھی چھپالی اور دوسرے پر میں اپنے بچے کو لپٹالیا۔ ایک شام احمد عدوی اس کے پاس رہنا چاہ رہا تھا مگر اس نے اس ڈر سے کہ کہیں وہ کنگھی نہ کھودے، اسکے ساتھ وقت گذارنے سے انکار کردیا۔ فاختہ نے یہ کہہ کر اس کی بے عزتی کردی کہ وہ کسی اور دنیا سے آیا ہے اور وہ خود کسی اور دنیا سے ہے، اور دونوں کو راست باز ہونا چاہئے۔ احمد عدوی کو بہت غصہ آیا مگر وہ اپنے جذبات چھپا گیا۔ ایک دن احمد عدوی نے اس سے سمندر کے کنارے تفریح کرنے کے لئے کہا اور وہ راضی ہوگئی۔ سمندر کے کنارے احمد نے ایک بڑا سا ہار نکالا اور اس سے کہا کہ وہ جھک جائے تا کہ وہ یہ ہار اس کے گلے میں ڈال سکے۔ اس نے کہنا مان لیا، اور احمد نے چوری سے وہ کنگھی اس کے پر کے نیچے سے نکال لی اور چپکے سے سمندر میں پھینک دی۔ جب وہ گھر واپس لوٹی تو اپنے بیٹے کو قریب المرگ پایا۔ اس نے بیٹے کے چاروں طرف اپنے پنکھ پھڑ پھڑائے تو یہ دیکھ کر خوفزدہ ہوگئی کہ کنگھی غائب ہے۔ وہ احمد کے پاس بھاگی، مگر وہ وہاں نہیں تھا۔ وہ اپنے بیٹے کے پاس واپس پہنچی تو وہ ختم ہو چکا تھا۔ جب سے ہر چیز بولتی ہے مگر فاختہ نہیں بولتی، وہ صرف روتی ہے۔"

وہ آگے جھکی اور اپنے روکھے، الجھے بال نوچنے لگی جو دبیز نقاب میں چھپے ہوئے تھے۔ اس نے سرگوشی کی "فاختہ ایک عورت ہے"۔

میری ساتھی اٹھ کھڑی ہوئی، اور اپنی آنکھوں تک ہاتھ لے گئی جیسے وہ ایک خواب دیکھ رہی تھی۔ اس نے کہا "اب مجھے پتہ چلا۔"

میں نے چاروں طرف دیکھا۔ کمرہ تقریباً خالی ہو چکا تھا۔ کلینک بند ہوگیا تھا اور عورتیں جا رہی تھیں۔ میں ان کے پیچھے کہتے ہوئے چل پڑی "فاختہ ایک عورت ہے۔"

☆☆☆

بس مجھے خواب دیکھنے کا حق دو

فاطمہ العتیبی

اِس کی آنکھیں خالی خالی ہیں، ہر چیز بے معنی ہوگئی ہے۔ یہاں تک کہ نام بھی کچھ معنی نہیں رکھتے۔ اور اُن کی آنکھوں میں سر سبز میدان پھیلے ہوئے تھے، جن میں پھول کھلتے ہیں، نئی کونپلیں نمودار ہوتی ہیں۔

جب وہ ہنستے ہیں تو وہ بھی ہنسنے لگتی ہے۔ اکثر تو وہ یہ بھی نہیں سمجھ پاتی کہ وہ کیوں ہنس رہے ہیں مگر وہ ان کا ساتھ ضرور دیتی ہے۔ یہ بات بہت عجیب تھی مگر وہ اس سے ہی خوش تھی کہ کم سے کم کچھ تو ہے جس میں وہ اُن کا ساتھ دے سکتی ہے۔

وہ ایک ڈاکٹر کی بیوی ہے۔

پڑھنے کے میز کی دراز میں اسکا چوتھی جماعت کا سارٹیفکٹ رکھا ہے۔ بڑا بڑا لکھا ہے ''چوتھی جماعت پاس''۔ اور میز کے اوپر دیوار پر اُن کے سارے سارٹیفکٹ آویزاں تھے۔ پرائمری سے لے کر ڈاکٹریٹ تک کے سارٹیفکٹ۔

''تم کتنی خوش قسمت ہو'' عورتیں کہتی ہیں ''اتنے پڑھے لکھے آدمی سے تمہاری شادی ہوئی ہے۔'' یہ جملہ اس کا تمغہ ہے، باقی باتوں سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ ایک ڈاکٹر ہیں یہ ہی اس کی خوش قسمتی کے لئے کافی ہے۔

اسکا دل چاہتا ہے کہ دونوں کے بیچ کوئی تو تعلق ہو۔ وہ بھی اس سے اسی طرح باتیں کریں جیسے دوسرے شوہر اپنی بیویوں سے کرتے ہیں۔ وہ چاہتی ہے کہ وہ جب اُن کے ساتھ ہو تو دبی، جھنپی سی نہ رہے، بات کرتے میں ہکلائے

نہیں۔ اسلئے وہ اُن کے ساتھ سے کترانے لگی تھی۔

وہ اُن کے آنے سے پہلے کھانا تو تیار دیتی تھی مگر ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانے سے بچتی تھی۔ جب وہ اسے ساتھ کھانے کے لئے بلاتے تھے تو اس کے ہونٹوں سے وہی الفاظ نکلتے جو وہ سننے کے عادی تھے۔ ''میں نے پہلے ہی کھالیا۔''

''میں نے پہلے ہی کھالیا۔'' ہر شام جب وہ یہ الفاظ کہتی تو اسے بچوں جیسی خوشی ہوتی۔ پر دل میں کہتی ''مگر صرف ڈنر، ورنہ باقی اور چیزوں میں تو میں بھوکی پیاسی کھنڈروں میں قید ہوں۔ اور تم.... تم دوڑتے رہتے ہو، اپنے ثوب (لمبا گاؤن جو سعودی مرد پہنتے ہیں) کے دامن کو دانتوں میں دبائے تیزی سے دوڑ رہے ہو۔ تم اپنی پی ایچ ڈی کا تاج پہنے، راستے کی ہر رکاوٹ سے لڑتے، مستقبل کی طرف دوڑ رہے ہو۔''

مگر پھر وہ اپنی پریشانیوں، الجھنوں اور سوالوں میں گھر جاتی ''کیا وہ مجھے چلنے کے قابل بھی سمجھ سکتے ہیں؟ کیا میرے پاؤں ہیں جن پر میں چل سکتی ہوں۔ مجھ جیسی برباد کے لئے صرف آنسو ہی لکھے ہیں۔ انھیں جو چاہئے اس کے لئے وہ جدو جہد کرتے ہیں، اور میں پتھر بنی اپنی جگہ ہی پڑی رہتی ہوں۔

ایک رات جب ہمیشہ کی طرح وہ ان کے لئے میز پر کھانا لگا چکی تو دل نے کہا کہ آج وہ انھیں بتادے کہ اس میں بھی آگے بڑھنے کی صلاحیت ہے۔ غیر ارادی طور پر اس نے ایک قدم بڑھایا، دوسرا بڑھایا، اور خود کو ان کے سامنے پایا۔ انھوں نے کھانا شروع کیا، مسکرا کر کہا۔

''تمھیں بھوک نہیں لگی؟''

''نہیں، یہاں میں نے تم کو مات دے دی۔''

''بھوک میں؟''

''نہیں، ڈنر میں۔''

''جی، جی.....ہمیشہ کی طرح۔''

وہ کافی دیر تک یوں ہی بیٹھے سامنے دیکھتے رہے اور پھر اسکی طرف غور سے دیکھا مگر وہ پھر اپنے خول میں سمٹ گئی۔ اُن کے چہرے پر الجھن اور پریشانی عیاں تھی۔

''ہوں! تو آج شام وہ پریشان ہیں'' اس نے سوچا'' وہ بھی تو پچھلے چھ سال سے پریشان ہے، یہ الجھن اور پریشانی مجھے کھا گئی ہے.....کچھ نہیں بچا ہے۔۔۔۔کچھ بھی نہیں۔ مگر کیا وہ ایک خوش قسمت بیوی نہیں ہے؟ ڈاکٹر سے شادی جو ہوئی ہے۔''

وہ اسکے سامنے بیٹھے تھے انھوں نے اسکی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔

''اور کب تک؟''

''کیا مطلب ہے، کب تک؟'' وہ بولی

''میں تمہارے انتقام کا شکار کب تک رہوں گا؟''

''میرا انتقام ؟''

'' آج شام، اس لمحے ، میں اس خاموشی کے خلاف جنگ کا آغاز کرتا ہوں جو پچھلے پانچ سال سے ہمیں کھائے جا رہی ہے، پانچ سال پہلے جب ہمارے بچے کی موت ہوئی تھی۔ میری وجہ سے تو اس کی موت نہیں ہوئی۔ میں اس شام موجود نہیں تھا، میں اس شام کہیں محنت سے کام کر رہا تھا تا کہ جب وہ بڑا ہو جائے تو مجھ پر فخر کرے۔''

ہاں، اس کا بیٹا جسے ڈاکٹر کی مدد نہ مل سکی۔ وہ اسے اپنی بانہوں میں لئے بیٹھی رہی تھی.....جب اس کے شوہر، پی ایچ ڈی، گھر آئے تو دیکھا کہ اس کا بچہ گود میں مرا ہوا تھا۔

''تم مجھے ایک اور بچہ دے سکتی تھیں،'' وہ کہہ رہے تھے'' مگر تمہارا انتقام

بہت لمبا ہو گیا۔''

''اور تم.... تم نے کیا کیا؟'' اس نے کہا'' اور تم نے بھی ضد میں مجھے ہمیشہ نظر انداز کیا۔ تم نے سارے دروازے مجھ پر بند کر دیئے، مجھے ایک ایسی عورت بنا دیا جو تمہارے لئے صرف کھانا پکا سکتی ہے، گھر صاف رکھ سکتی ہے۔ تم نے کبھی نہیں سوچا کہ میرا ہاتھ تھام کر اپنے ساتھ لے کر چلو، اپنی طرح باشعور انسان بناؤ۔ ہوسکتا ہے کہ میں اپنے انتقام میں بہت آگے نکل گئی ہوں مگر تم بھی اپنے انتقام میں بہت دور تک چلے گئے۔ تم میری جہالت کے سائے میں اپنی ذہانت میں مست رہے۔ تم سب کچھ تھے، میں کچھ بھی نہیں۔''

''نہیں، اگر میں تمہاری دوسرے بچے کی خواہش پوری کر دیتی تو وہ بھی تمہاری بے توجہی سے مر جاتا، یا قابل و ذہین باپ اور ان پڑھ ماں کے بیچ ادھورا ہی پلتا۔ ان والدین کے بیچ پلتا جن میں سے ایک مستقبل کے لئے ہوا کی رفتار سے بازی لگاتا ہے اور دوسری جو خاموشی کی دیوار کے پیچھے انتظار کرتی رہتی ہے۔ جس کے پاس کوئی خواب نہیں، آگہی نہیں، بس خلاٗ ہے۔ میرے اندر تو ماں بننے کا خواب بھی مر چکا ہے۔''

''مجھے خواب دیکھنے دو''، وہ کہتی رہی۔'' مجھے اپنا ہاتھ دو، صرف تم ہی میری ساری سیاہ یادیں مٹا سکتے ہو۔ مجھے میرے خواب دو تا کہ میں تمہارے خواب لوٹا سکوں۔''

دوسرا حصّہ

خسارہ

خیریہ السقاف

اف! میں کل سے یہاں ان سب عورتوں کے ساتھ ہوں جو اپنے اپنے جرائم کے بارے میں باتیں کر رہی ہیں۔ ہر ایک اپنی غلطی یاد کر رہی ہے جس کی وجہ سے وہ اس جگہ آئیں ہیں، مگر میں یہاں کیوں لائی گئی ہوں؟ مجھے کچھ معلوم نہیں۔

کچھ دیر پہلے میں نے سوچا کہ میں سونے کی کوشش ہی کروں۔ میں اپنا عبایہ سر کے نیچے رکھ کر عورتوں کی جیل کے ایک کونے میں فرش پر لیٹ گئی۔ بھیڑ، شور، زور زور سے ہنسنے کی آوازیں.....عورتیں بیج چبا چبا کر چھلکے تھوک رہی تھیں۔

جیل میں بھی ان کی یہ عادت نہیں جاتی اور وہ دوسروں کے بارے میں فضول باتیں کرتی رہتی ہیں۔ مگر میں یہاں نہیں سو سکتی۔ میں نے اِدھر اُدھر کروٹیں بدل کر کوشش کی۔ اب میں نے اپنی ٹانگیں سمیٹ کر بازؤں میں جکڑ لی ہیں اور گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے ہوئے عورتوں کی حرکتیں دیکھ رہی ہوں۔

کچھ دیر پہلے ان میں سے ایک نے آکر مجھ سے پوچھا ''تمہیں کیا ہوا ہے؟ جب سے آئی ہو خاموش ہو'' پھر وہ مسکرائی اور میری پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی ''ایک آدھ دن میں تم اس زندگی کی عادی ہو جاؤ گی۔''

اردگرد کی ہر شے کی طرح، مجھے عورتوں کے ہنسنے کی آواز بھی تاریک اور ملول لگ رہی ہے۔ ان کی ہنسی کی آواز ہے جیسے کہیں انجان اندھیرے میں سانپ پھنکار رہے ہوں۔ میں پوری جان سے کانپ رہی ہوں۔ میں یہاں کیوں لائی گئی ہوں؟ میں کس

چیز کی خطاوار ہوں، غریبی؟ بدبختی؟

کل ہی کی بات ہے، میں کپڑوں کے ڈھیر میں اپنی دوا کی گولیاں تلاش کر رہی تھی جو مجھے روز کھانی ہوتی ہیں۔ وہ گولیاں میں نے ڈھونڈ نکالی تھیں کہ کسی کے زور زور سے دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ دروازہ کھولا تو حیران رہ گئی، یونیفارم میں ایک پولس والا کھڑا تھا۔

''کیا سارہ عبدو یہاں رہتی ہے؟'' اس نے پوچھا

''میں ہی ہوں۔''

''مجھے یہاں کی تلاشی لینے کے حکم دیا گیا ہے۔''

''مگر کیوں جناب ؟''

''تم پر ڈرگس رکھنے کا الزام ہے۔''

''ڈرگس! نہیں، نہیں! جناب پولس مین، اللہ معاف کرے! میرے پاس کوئی ڈرگس نہیں ہیں۔ توبہ، توبہ، یہ تو ہو ہی نہیں سکتا، میرے پاس ایسا کچھ نہیں ہے۔ پھر ایک دم مجھے اپنی عزت اور ناموس کا خیال آیا، میں غصہ ہوگئی '' آیئے، تشریف لایئے!'' میں نے اس سے کہا '' چلئے گھر کی تلاش لے لیجئے''۔

''میرے راستے سے ہٹو، یہیں کھڑی رہو۔''

پولس والے نے ہر جگہ تلاشی لی، تینوں کمرے، ڈھنڈار پڑا ہوا کوٹھا، کوڑے کباڑ سے بھرا اسٹور روم، کچن (جسے اس وقت میں نے دیکھا کہ بہت گندا پڑا تھا)

''معاف کیجئے یہ اتنا گندا ہے'' میں نے معذرت کی۔

''کیا تمہارے پاس کچھ گولیاں ہیں؟''

''جی! بالکل ہیں، میری دوا ہے۔''

''تو پھر مجھے دکھاؤ۔''

''یہ لیجئے۔''

اس نے گولیاں دیکھیں، پھر میری طرف دیکھا اور کہا ''تمھیں گرفتار کیا جاتا ہے!''

''کیوں؟ آپکو تو میرے ہاں کچھ نہیں ملا۔ جناب! میں اس نابینا آدمی جو میرے دروازے پر بیٹھا ہے اسکا کیا کروں۔ میرے بچوں کا کیا ہوگا، ان کی دیکھ بھال کون کرے گا؟''

''یہ تمہاری ہی غلطی کا انجام ہے، اب بھگتو۔''

میری غلطی؟ میں نے کیا کیا ہے؟ کس نے مجھ پر الزام لگایا؟ میں یہاں کیوں ہوں؟

دوا..... نیند..... سیدھے کھڑے ہونے میں دشواری...... نہیں، نہیں میری دوا نشہ آور نہیں ہوسکتی...... میں کانپ رہی ہوں.......

سر جھٹک کر میں اس خیال کو دماغ سے نکالنا چاہتی ہوں..... مگر کیوں نہیں ہوسکتا؟ میں جب یہ دوا لیتی ہوں تو نیند آجاتی ہے اور مجھے یہ روز لینا پڑتی ہیں۔ میں روز اپنی دوا لینا چاہتی ہوں، اس سے پہلے کہ میں اسے یاد کروں یہ مجھے خود پکار لیتی ہے۔

جس دن میرے شوہر نے مجھے طلاق دی، اس نے میرا سب کچھ لوٹ لیا۔ صرف میرے زیور ہی نہیں اس نے میرے جعلی دستخط کر کے مجھ سے میرا گھر، میرے کپڑے، میرے برتن، چائے دانی، کنگھی ہر چیز چھین لی۔ وہ میرے بال کھینچتا ہوا دروازے تک لایا اور بالکل خالی ہاتھ مجھے باہر دھکیل دیا۔

میں دیوانی سی ہوگئی، سیدھی حامدہ کے گھر چل پڑی۔ بوڑھی حامدہ جس کے پاس ہمیشہ محلے والوں کے تکلیفیں دور کرنے کی دوائیں رہتی تھیں۔ جب میں نے اس کا دروازہ کھٹکھٹایا تو مجھے لگا جیسے وہ میرے آنے کی منتظر تھی۔ اس نے میرے لئے اپنے گھر کے دروازے کھول دئے۔ میں رونے لگی تو اس نے گلے سے لگا کر میرے شانے تھپتھپائے۔ میرے خون آلود چہرے کو پونچھا اور میرے پھٹے ہوئے گریبان کو

ڈھانپا۔ وہ میرے لئے ایک گلاس پانی اور کچھ گولیاں لے آئی۔

''ان سے تمہارے سر کا درد ہلکا ہو جائے گا''۔ میں نے شکریہ کہہ کر وہ گولیاں نگل لیں۔

''تم فکر مت کرو سعدہ'' حامدہ نے کہا ''اللہ نے تمہاری مدد کردی۔ تمہارے لئے میرے پاس ایک شوہر ہے، گھر ہے۔ مگر اب تم تھوڑا سو جاؤ، بعد میں ہم تمہارے مستقبل کے بارے میں بات کریں گے۔''

میں حیران ہو کر سوچ رہی تھی ''حامدہ ہمیشہ لوگوں کو تسلی دیتی ہے۔ وہ شاید مجھے ایک طرح سے امید دلا رہی ہے تاکہ مجھے کچھ تسلی ہو جائے۔''

میں سو گئی، جب میں جاگی تو حامدہ نے مجھے پھر اور گولیاں دیں، اور اس کے بعد کچھ دن تک صبح، شام اور رات تینوں وقت دیتی رہی۔ ان گولیوں کی مدد سے میں اپنی بربادی اور مشکلات بھول گئی۔

پھر ایک دن حامدہ نے اشارہ کیا، ''سعدہ، یہ دوا کی گولیاں بہت مہنگی ہیں، اور کیونکہ تمہیں ان کی اور ضرورت ہے اس لئے تم کو ان کی قیمت دینی ہوگی۔ میں ایک غریب عورت ہوں لہذا اپنی دوا مہیا کرنے کے لئے تم کو میری مدد کرنی ہوگی۔''

''مگر کیسے؟'' میں کہاں سے پیسے لاؤں؟ میرے پاس تو پھوٹی کوڑی نہیں ہے۔ نہ کوئی زیور ہے، نہ کوئی کاغذ پتر! اگر تم نے سخی بن کر مجھ پر مہربانی نہ کی ہوتی تو میرے پاس تو تن ڈھانپنے کو کپڑے تک نہیں ہوتے!''

حامدہ مسکرائی نہیں، سنگین اور چبھتی ہوئی آواز میں بولی ''اے سعدہ، اس میں کوئی شک نہیں کہ میں تمہاری ماں کی طرح ہوں، یہ گھر تمہارا ہے۔ مگر مجھ پر ذمہ داریوں کا اور خرچ کا جو بوجھ ہے وہ تم دیکھ ہی رہی ہو، خاص کر دواؤں اور کپڑے لتوں کا خرچ۔ تم اپنے سر پر چھت اور کھانے کی فکر مت کرو کیونکہ تم میرے ساتھ میرے گھر میں رہ سکتی ہو کھا سکتی ہو، مگر.......''

''میں کیا کر سکتی ہوں؟ مجھ پر تمہارے بہت احسانات ہیں!''

''تمہارے لئے ایک شوہر ہے، میری پیاری۔ میرے خیال میں تمھیں اس کو قبول کر لینا چاہئے۔ اس کے پاس مکان ہے، کچھ پیسے بھی ہیں اور اسکے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں جن کو ماں کی ضرورت ہے۔''

''چھوٹے چھوٹے بچے؟'' بچے ہمیشہ میری کمزوری رہے ہیں۔ میری اپنی شادی سے کوئی اولاد نہیں تھی مگر جب میری ایک پڑوسن کا انتقال ہو گیا تھا تب سے میں اس کے دو بچوں کی دیکھ ریکھ کرتی تھی۔ مگر میرے شوہر نے اور تمام چیزوں کے ساتھ مجھے اس سے بھی محروم کر دیا تھا۔

حامدہ نے مجھے جھنجھوڑا ''سعدہ! کہاں کھو گئیں؟ کیا کہتی ہو؟ اس سے شادی کروگی؟''

''ہاں، بالکل''، میں نے کہا ''میں بالکل راضی ہوں۔''

میری اس سے شادی ہوگئی، اس دن میں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ وہ نابینا تھا حالانکہ وہ دیکھنے کی اداکاری کر رہا تھا۔ اس کا ایک چھوٹا سا گھر ضرور تھا اور بس۔ وہ کوئی کام کرنے کے لائق نہیں تھا۔ بچوں کو واقعی دیکھ بھال کی ضرورت تھی۔ میں نے کچھ گھروں میں خادمہ کا کام ڈھونڈ لیا تاکہ اسکا، بچوں کا اور اپنا پیٹ پال سکوں۔

ایک دن جب میں ناقابل برداشت حد تک تنہا، تھکی ہوئی اور پریشان تھی، حامدہ کے پاس گئی ''مجھے اور گولیاں چاہئیں۔ میرے پاس کچھ پیسے ہیں۔''

مگر حامدہ نے کہا کہ اس کے پاس گولیاں نہیں ہیں، اس نے مجھے اپنے ایک پڑوسی فالح کا پتہ بتایا۔

''مجھے پتہ ہے اس کے پاس گولیاں ہیں۔'' اس نے کہا تھا۔

میں نے اس کے دروازے پر دستک دی، اس نے دروازہ کھولا اور مجھے غور سے دیکھا۔ پھر اسنے ہاتھ بڑھا کر میرا عبایہ پکڑ کر مجھے اندر گھسیٹ لیا۔ وہ میرے قریب آ گیا اور اپنے مضبوط بازوؤں میں مجھے سمیٹ کر زور سے بھینچا۔ میں چیخی مگر

اس نے مجھے اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک گولیوں کی قیمت نہیں وصول کر لی۔
اس نے مجھے چوما چاٹا اور میرے ساتھ منہ کالا کیا۔

جب میں نے اپنے کپڑے سنبھالے، اس نے مجھے بہت سی گولیاں تھما دیں۔ میں نے وہ اس کے منہ پر دے ماریں اور اس کے گھر سے نکل بھاگی۔ اپنے گھر پہنچ کر مجھے آئینے میں اپنی شکل دیکھنے سے شرم آ رہی تھی۔

مغرب کے بعد حامدہ میرے دروازے پر آئی اور مجھے گولیاں تھما دیں ''یہ مفت ہیں'' اس نے کہا۔ جب میں نے لینے سے انکار کیا تو مسکرا کی بولی'' آج تو تم کو ان کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔''

میں نے جیل کی عورتوں پر نظر ڈال کر ایک ٹھنڈی سانس لی۔ نہ جانے ان میں سے کتنی حامدہ جیسی ہونگی اور کتنی میرے جیسی ہوں گی؟

☆☆☆

زعفران

فاطمہ الدوسری

زیادہ تر نمازی مسجد سے نکل کر مختلف گلیوں میں اپنے اپنے کام کی طرف چل پڑے۔ ضعیف، کمزور شیخ نکل کر تیزی سے ہانپتا کانپتا بازار کی طرف چلا۔ وہ بازار کا ایک اور چکر لگانے کی تیاری کرنے لگا۔ اس نے ایک دیوار کے سائے میں رک کر کپڑے میں لپٹا ہوا گتے کا چھوٹا سا کارٹن نکالا، زمین پر کپڑا اچھا کر کارٹن اس پر رکھ دیا۔ پھر اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ ریال نکالے اور انھیں گنتے ہوئے بڑبڑایا،

''بیس ریال بچے ہیں، یااللہ!''

اس نے اپنا کارٹن اور کپڑا اٹھا کر بازار کا پھیرا کرنا شروع کر دیا، تھکی ہوئی افسردہ سی آواز لگانے لگا۔

''زعفران، زعفران، اے خواتین! زعفران۔''

سڑک پر اس کے بڑھتے قدموں کے آگے آگے یادیں چل رہی تھیں۔ روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کے تلاش میں دوڑتے ہوئے برسوں کی یادیں۔ ان پُرانے دنوں میں بھی زندگی مشکل تھی مگر سادہ تھی۔ اسکا اپنا چھوٹا سا گاؤں، کھیت، بھیڑیں، پہاڑیاں، اسے سب کچھ یاد آ رہا تھا۔ اسے تو مٹی اور بارش کی خوشبو تک آ رہی تھی۔

ایک آواز اس کو خیالوں کی دنیا سے واپس لے آئی، ''زعفران کتنے کا ہے بابا؟''

''چھوٹی ڈبیا پانچ ریال کی، اور بڑی دس ریال کی۔''

حقیقت گمشدہ یادوں سے بالکل مختلف تھی۔ وہ آدمی زعفران کی چھوٹی

ڈبیاں دیکھنے لگا، تو اس نے پوچھا ''تمھیں چاہئے بیٹا؟''

اس آدمی کے ہونٹوں پر لمحے بھر کے لئے مکروہ سی مسکراہٹ آئی پھر وہ اپنی جیب تھپتھپاتے ہوئے چل پڑا۔

شیخ نے ڈبیاں ٹھیک کیں اور پھر سے پھیری لگانے لگا۔ ''زعفران، زعفران، اے خواتین، زعفران۔''

بازار میں بھیڑ بڑھ گئی تھی۔ اب یادوں میں کھو جانے کی وقت نہیں تھا۔ وقت تیزی سے جا رہا تھا۔ اس کی نگاہیں سامنے سے گذرتے ہوئے ہاتھوں کا تعاقب کر رہی تھیں، اس امید میں کہ اس میں سے کوئی ہاتھ تو اس کے زعفران کی چند چھوٹی ڈبیاں لے کر ان کی قیمت دے دے گا۔ کاش اسکے پاس ایک بڑی سی دکان ہوتی جس میں بہت سے گاہک ہوتے۔ ایک بار پھر وہ یادوں کے ساحلوں کی طرف نکل گیا۔ اس کے پوتے کی آواز آ رہی تھی۔

''دادا سنئے! میں بڑا ہو کر آپ کے لئے ایک بڑا سا اسٹور کھولوں گا جہاں آپ زعفران بیچئے گا۔''

یہ آواز اسے کہیں دور لے گئی۔ وہ ایک راہگیر سے ٹکراتے ٹکراتے بچا، ایک بدزبان آدمی کی ڈانٹ اور گالیاں اسے یادوں کی دنیا سے واپس لے آئیں، مگر وہ بالکل خاموش رہا۔

تھکے ہارے بوڑھے شیخ کے چہرے پر دکھ کی لکیریں تھیں، وہ ایک جھٹکے سے مڑا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا، کچھ تیز کچھ دھیمی، ملی جلی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وقت گذرا جا رہا تھا، کوئی زعفران نہیں خرید رہا تھا۔

اس کی آنکھوں میں اپنے پوتے کا چہرہ گھوم گیا، وہ گھر کی دہلیز پر بیٹھا انتظار کر رہا ہوگا، اس امید پر کہ اس کے دادا کے ہاتھوں میں gym سوٹ ہوگا جس کی فرمائش اس نے ہفتوں پہلے کی تھی۔

''ارے میرے بچے! وقت ختم ہوتا جا رہا ہے'' اسے پوتے سے کہنا پڑے گا

''کل تمہاری gym کی کلاس ہے اور کوئی زعفران نہیں خرید رہا تھا۔'' اسے محسوس ہوا کہ جیسے اس کے گھٹنوں میں کوئی چیز چبھ رہی ہے، بازار کے چکر کاٹ کاٹ کر اسکی ٹانگیں کانپ رہی تھیں، ''نہیں، میں نہیں رکوں گا... مجھے بیچنا ہی ہوگا...... یا اللہ!''

اس نے سڑک کے پار کھیل کے سامان کی دکان کیطرف دیکھا، سامنے ہی طرح طرح کے مختلف سائز کے اور رنگوں کے کپڑے سجے ہوئے تھے۔ اس کے چھوٹے پوتے کے لئے ایک بالکل مناسب سوٹ موجود تھا۔ دو دن پہلے اس نے اسکی قیمت معلوم کی تھی، دکاندار نے کہا تھا،

''تیس ریال۔''

اور پچھلے دو دن سے کسی نے زعفران نہیں خریدا۔ جب کبھی اس نے اس کے لئے رقم جمع کرنیکی کوشش کی تو کھانے اور گھر کی دوسری ضروریات پر خرچہ ہو گیا۔ اور اب اسے اپنے پوتے کی آنکھوں میں آنسو نظر آرہے تھے، وہ اپنے پرانے gym سوٹ کے چھید اپنی دادی کو دکھا رہا تھا جو اسکی مرمت کرنیکی کوشش کرے گی۔

ایک عورت بازار کے دوسرے سرے پر اپنی خادمہ اور ڈرائیور کیساتھ کھڑی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ کچھ الگ سی بات کرے۔ کچھ ایسا جو اسکی زندگی کی بے رونقی کو کم کردے۔ دولت کے باوجود وہ خوش نہیں تھی۔ نقاب کے پیچھے سے اسکی نگاہیں دوسرے چہروں پر خوشی تلاش کر رہی تھیں۔ ایک بوڑھی عورت اس کے پاس سے گذری جو غم زدہ سی لگ رہی تھی۔ اس نے اسکو کچھ رقم دینی چاہی جو اس نے نہیں لی، بولی ''مجھے نہیں چاہیے۔''

اسکا سچی خوشی پانے کا خواب پورا ہوتا نہیں نظر آرہا تھا۔ وہ بھیڑ میں شامل ہو کر بازار کی رونق دیکھنے لگی۔ دکانوں کے شوکیس تو دیکھ رہی تھی مگر اندر جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ ایک دبلا پتلا سا شیخ زعفران بیچتا ہوا اس کے پاس سے گذرا مگر اس کی نظر نہیں پڑی۔

مغرب کی آذان کی آواز، دکانوں کے بند ہونے اور لوگوں کی چلنے پھرنے

کی آوازوں میں گھل مل گئی۔تب اس نے دیکھا کہ ایک لاغر، بوڑھا شیخ سڑک کے کنارے کھڑا آسمان کی طرف ہاتھ کئے ہوئے دعامانگ رہا تھا۔ پتہ نہیں وہ کیا کہہ رہا ہوگا۔وہ اس کے قریب گئی تو بوڑھے کی آنکھوں میں آنسو نظر آئے۔

''ان آنسوؤں کے پیچھے کون سا دکھ ہے؟'' اس نے سوچا۔ پھر اس نے قریب رکھے کارٹن کو دیکھا کہ اس میں کیا رکھا ہے۔

''زعفران! مجھے زعفران چاہئے!'' اس نے شیخ کو پکارا جو گلی میں مڑ رہا تھا۔

''چچا !زعفران کتنے کا ہے؟''

بوڑھے نے اس کی طرف پُر امید نگاہوں سے دیکھا اور کانپتے ہاتھوں سے زعفران کی چھوٹی ڈبیا اسکی طرف بڑھا دی۔

اس نے ڈبیا بوڑھے کے ہاتھ سے لے لی اور بغور اس کا چہرہ دیکھا۔وہ چہرہ اس کے چہرے سے کتنا مختلف تھا۔''میں تمہارا سارا زعفران خریدوں گی۔'' اس نے کہا'' کتنا ہے تمہارے پاس؟

''خدا تمھیں خوش رکھے'' بوڑھے نے کہا۔آذان کی آواز آتی رہی۔'' خدا تمھیں خوش رکھے'' اس نے دہرایا۔بوڑھا مسجد کی طرف چلا اور وہ اپنی کار کی طرف۔

گھر جاتے ہوئے اسے ایک نیا احساس ہو رہا تھا۔اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اس بوڑھے شیخ کو اور قریب سے جان سکتی۔کئی دنوں بعد وہ آج خوش تھی، مسکرا رہی تھی۔اس نے خود سے دعدہ کیا کہ وہ اس جگہ پھر واپس آئے گی زعفران خریدنے کے لئے، اس بوڑھے کے آنسوؤں کا راز جاننے کے لئے، اور دوسری آنکھوں کے راز جاننے کیلئے جن میں اس نے ابھی نہیں جھانکا ہے۔

☆☆☆

بدھ کی شام

بدریہ البشر

حیٰ تیز تیز چل رہی تھی جیسے کوئی مرد بے رحمی سے اپنے جوتوں کے تلے زمین کو روندر رہا ہو۔ وہ دبلی پتلی اور سپاٹ سینے والی عورت ہے جیسے کوئی نو عمر لڑکی جس میں نسوانیت کے آثار ابھی نمایاں نہیں ہوئے ہیں۔

وہ سوچ رہی تھی کہ اس کا بیٹا راشد پڑوسی کے بچوں کے ساتھ اسکول سے واپس آیا کہ نہیں۔ دوپہر کے سورج کی شعاعیں اسکے کالے عبائے اور نقاب میں جذب ہوئی جا رہی تھیں۔ سڑک پر کاروں اور اسکول سے نکلنے والے بچوں کی بھیڑ تھی جو سارے دن بھر کی پڑھائی کے بعد تھک چکے تھے۔ ان میں سے ایک بچی نے اپنی فلپینی خادمہ کی طرف ہاتھ بڑھایا جو اپنے سر پر بندھے اسکارف کو کس کر باندھتی ہوئی بچی کا ہاتھ پکڑ کا گھسیٹی ہوئی لیکر چل دی۔

بچے آپس میں لڑتے جھگڑتے، اچھلتے کودتے، گرتے پڑتے چلے آرہے تھے۔ حیٰ کی بیٹی اس کی انگلی تھامے اس کے پیچھے بچوں کو دیکھتی ہوئی چل رہی تھی۔ وہ یہ سب روز دیکھتی ہے مگر تب بھی اس کا دل نہیں بھرتا۔ ننھی فاطمہ لڑکیوں کے سفید ربنوں، اسکول کے بستوں پر بنی ہوئی رنگین تصویروں کا معائنہ کرتی ہوئی، بچوں کا جوتوں کی ٹھوکر سے کنکروں کو اچھالنے کا کھیل دیکھتی ہوئی چل رہی تھی۔ حیٰ دل ہی دل میں حساب لگانے لگی۔

''آج بدھ کا دن ہے اور جمعرات کی شام کو ہفتے وار چھٹی سمجھو ختم ہی ہو جاتی ہے۔ ابھی اس کو میدہ خریدنا ہے، اور ایک کھانا پکانے کی ترکیبوں والی نئی کتاب لینی

ہے تا کہ ویک اینڈ پر کچھ خاص کھانا تیار کر سکے ۔''

راشد گھر کے سامنے انتظار کر رہا تھا اور مزے سے رنگین کارڈوں سے کھیل رہا تھا۔اپنی چھوٹی بہن کے آتے ہی اس نے بہن کی چوٹی کھینچی، بہن نے زوردار چیخ مار کر اماں کو پکارا۔حیٰ نے اس کو ایک تھپڑ رسید کر کے ڈانٹا،

''کتنی بار تم سے کہا ہے کہ اس طرح نہ چیخا کرو۔''

فاطمہ پھر چلائی ''مگر وہ ہی تو میری چوٹی کھینچ رہا ہے۔''

حیٰ نے کہا ''میں تمہاری چوٹی کاٹ دوں گی تا کہ تمہاری چیخوں سے پیچھا چھوٹے۔تم یہ ہی چاہتی ہونا؟

فاطمہ کی آنکھوں میں خفگی بھری حیرانی تھی اور راشد کی آنکھیں اپنی جیت پر چمک رہی تھیں۔مگر وہ ڈر رہا تھا کہیں اماں اس کو بھی ایک ہاتھ نہ جڑ دیں۔

ہر بدھ کی شام کی طرح شام پانچ بجے حیٰ دوپہر کے قیلولے کے بعد اٹھی، لاؤنج کی طرف آئی اور وہ سب کام کرنے لگی جن کا کوئی فائدہ نہیں، یہ بات وہ خوب سمجھتی ہے۔اس نے آواز لگائی،

''چلو سب لوگ، اپنی کتابیں لاؤ اور میرے سامنے بیٹھو۔''

''مگر آج تو بدھ ہے، یہ تو ویک اینڈ ہے'' راشد نے کہا جو باہر سیڑھیوں کے پاس سائیکل چلا رہا تھا۔

فاطمہ نے جب دیکھا کہ راشد کو اس بات پر کوئی ڈانٹ نہیں پڑی تو وہ بھی اپنی گڑیا کو گھسیٹتی ہوئی باہر چل دی تا کہ محلے میں اپنے بھائی اور انکے دوستوں کی سائیکل ریس دیکھ سکے۔حیٰ سوچ رہی تھی کہ اس نے بچوں سے پڑھنے کے لئے کہا ہی کیوں؟ابھی تو ویک اینڈ شروع ہی ہوا ہے۔

اس نے فون اٹھا کر شیخا کا نمبر ملایا مگر کوئی جواب نہیں۔اسے یاد آیا کہ شیخا تو ہر بدھ کی شام الخرج (ریاض کے پاس ایک شہر) چلی جاتی ہے اور جمعہ کی شام کو واپس آتی ہے۔وہ چائے دانی میں چائے بنا کر، نمکین بیجوں کا پیالہ لے کر ٹی وی کے سامنے

بیٹھ کر کارٹون دیکھنے لگی۔

اس نے چائے کی پہلی پیالی انڈیلی ہی تھی کہ دیکھا کہ اس کا شوہر آئینے کے سامنے اپنا غترہ (سعودی مرد جو بڑا سا رومال سر پر اوڑھتے ہیں) درست کر رہا تھا۔ رومال کے دونوں سرے ٹھوری کے نیچے لا کر برابر کئے ، پھر سر پر عقال رکھی (گول کالے رنگ کی پہیئے جیسی چیز جو رومال کو سر پر ٹکانے کے لئے رکھتے ہیں)۔ پھر رومال کے دونوں سرے پلٹ کر سر کے اوپر عقال میں اڑسے۔ وہ جب کمرے میں داخل ہوا تو اس نے شوہر کو ایک پیالی میں چائے انڈیل کر دی۔ وہ چپ چاپ چائے پیتا رہتا اور کچھ بیج اٹھا کر جیب میں ڈال لئے،

''بچے کہاں ہیں؟'' اس نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

''وہ باہر کھیل رہے ہیں۔ اگر تم جلدی آؤ تو روٹیاں لیتے آنا۔''

''میں جلدی نہیں آؤں گا۔ دفتر کے بعد دوستوں سے ملنے جاؤں گا۔ بیکری پاس ہی ہے، راشد اچھا خاصہ بڑا ہو گیا ہے اس سے کام کیوں نہیں لیتیں؟''

وہ دھڑ سے درواز بند کر کے چلا گیا اور بس حیٔ کے چہرے پر الجھن اور سوالات چھوڑ گیا۔

اس نے خود سے پوچھا'' کیا وہ ہر بدھ کی شب کی طرح شراب کے نشے میں دھت گھر لوٹے گا، بے معنی الفاظ بڑ بڑاتا ہوا؟ اور پھر ایک بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے گا، ایک بیکار پھٹے ہوئے پرانے جوتے کی طرح۔ جب اسے میری ہمدردی نہیں ملتی تو وہ تکیے میں منہ چھپا کر روتے روتے سو جاتا ہے یا پھر باتھ روم ہی میں سو جاتا ہے، منہ تک نہیں دھو پاتا۔''

اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا اس کی یہ شراب کی عادت ہے جس کی وجہ سے وہ اس سے محبت نہیں کر پاتی؟ وہ ٹرے اٹھا کر کچن کی طرف چل دی اور بچوں کے رات کے کھانے کیلیئے میدہ گوندھنے لگی۔ وہ پنیر کے سموسے شوق سے کھاتے ہیں۔ وہ خالی الذہن ہو کر میدے کے پیڑے بیل بیل کر سموسے بنانے لگی۔

اس نے ریڈیو آن کر دیا، گانا بج رہا تھا ''تمہاری محبوب آنکھیں....''
کیا وہ اس سے محبت کرتی ہے؟ اس نے خود سے یہ سوال کبھی نہیں پوچھا، اب یہ سوال کہاں سے آ گیا؟ یہ ریڈیو پر بجتے ہوئے گانے کا اثر ہے۔ جس میں محبت کا وہی پرانا احمقانہ راگ الاپا جا رہا ہے جو وہ سننا نہیں چاہتی۔
اسے محبت کا احساس کیوں نہیں ہوتا؟ وہ اس سے پوچھتا ہے کہ میں کیا اس سے پیار کرتی ہوں یا نہیں؟ یہ سوال بے رس ہے کیونکہ یہ سوال وہ صرف نشے اور آنسوؤں میں ڈوب کر ہی پوچھتا ہے۔ بس تب ہی یہ بدذات، احمقانہ اور غمگین ''محبت'' جاگتی ہے۔ کیا یہ محبت وہ نہیں ہے جیسی وہ چاہتی تھی؟ وہ صرف سولہ سال کی تھی جب اسنے اسے چرالیا تھا۔ اس وقت اسکے لئے محبت ایک رنگین کاغذ کی مانند تھی، ہاتھ سے لکھا ہوا ایک خط جس میں بہت سی ہجے کی غلطیاں تھیں اور اپنی ایک ہم جماعت سے مانگی ہوئی کتاب، ''محبت نامے کیسے لکھے جائیں'' میں سے لئے مستعار جملے تھے۔
وہ بس اس کتاب کو کھول کر جو بھی صفحہ سامنے آتا، اسے نقل کر کے اوپر ''میرے پیارے'' لکھ کر اور نیچے ''دل سے تمہاری'' لکھ دیتی تھی۔ پھر وہ اپنی چھوٹی بہن کو ایک ریال دے کر سامنے کے گھر بھیج دیتی تھی اور جب وہ لوٹتی تو ایک اور ریال دیتی۔ وہ وہاں خط لینے کے لئے موجود ہوتا تھا اور وہ بھی اس کی بہن کو ایک ریال دیتا تھا۔ پھر عطر میں ڈوبا ہوا خط واپس آتا جس کا ہر لفظ دماغ میں گھومتا رہتا۔
ایک کار کچن کی کھڑکی کے نیچے سے گذر رہی تھی اور اچانک بریک لگنے کی آواز آئی جیسے کتے چیخ رہے ہوں۔ وہ جلدی سے کھڑکی کھول کر اپنے بچوں کو دیکھنے لگی۔ دیکھا کہ کار میں کچھ نوجوان لڑکے لڑ جھگڑ رہے تھے، کار کی پچھلی سیٹ پر کتابیں اچھال رہے تھے۔ ان میں سے ایک کی نظر اس پر پڑی تو چلا کر اسے چھیڑنے لگا ''ان ہرن جیسی آنکھوں پر قربان جاؤں۔''
اس نے زور سے کھڑکی بند کر دی اور بڑبڑانے لگی ''خدا ایسے نوجوانوں کو

غارت کرے جو لوگوں کو شور مچا کر، کار کے ہارن بجا بجا کر پریشان کرتے ہیں۔''
مگر کیا یہ چھیڑ خانی اسے واقعی بُری لگی؟

اسکے خیال میں اس کے شوہر کا چہرہ گھوم گیا۔ یہ اس کی شادی کا آٹھواں سال ہے۔ سنگِ مرمر کے فرش نے اس کے جسم میں ایک ٹھنڈی سی لہر دوڑا دی۔ اس لڑکے نے چھیڑ خانی کر کے اس گرم رات میں محبت کا ایک ٹھنڈا سا مزہ دیا جب کہ اسے مضبوط بانہوں کے سہارے کی ضرورت تھی۔

''یا اللہ! میں روٹی پکنے کے انتظار میں تنور کے سامنے کیوں منتظر رہوں۔''

اس نے گھڑی کی طرف نظر کی ''بدھ کی رات اتنی طویل کیوں ہو جاتی ہے؟ اس لئے کہ وہ اس کا انتظار کر رہی ہے؟ اس لئے کہ بچوں کے ہوم ورک میں دیر ہو گئی ہے؟ رات کے کھانے وجہ سے جس کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے؟ اسلئے کہ اس شخص کو پرواہ نہیں کہ وہ کب گھر لوٹتا ہے۔'' رات گذرتی رہی اور وہ میدے کے سنے ہوئے برتن دھوتی رہی۔

کافی رات گئے بچے باہر کی دھول سے بھرے کپڑے پہنے پہنے، ٹی وی سیریئل دیکھتے دیکھتے سو گئے۔ وہ انکو بیڈ روم میں لے گئی۔ کتنی بار اس نے لڑکے اور لڑکی کے لئے الگ الگ بیڈ روم کے لئے کہا مگر اسے پرواہ ہی نہیں ہے۔

''اس کے لئے تو میں پرانے خیالات کی، نفسیاتی الجھنوں میں گھری عورت ہوں'' اس نے سوچا۔

وہ صوفے پر ٹی وی کے سامنے لیٹ گئی۔ اداکاراؤں کے لپے پتے چہرے دیکھنے لگی اور ان کو بُرا بھلا کہنے لگی، یہ ہی مردوں کے ذہن بھٹکاتی ہیں۔ وہ سوچنے لگی کہ اسی قسم کے ناز و انداز سے خواتین کو خطرہ ہوتا ہے جس میں اس قسم کی بازاری عورتوں کو ملکہ حاصل ہوتا ہے۔

اس نے گھڑی کی طرف دیکھا، آدھی رات ہو چکی تھی۔ وہی وقت جب وہ مدہوش ہو جاتا ہے اور رات دھندلی ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ جب وہ جاگے گا تو

کیا وقت ہو جائے گا؟ اسے ان کہانیوں سے خوف آتا ہے جو شرابیوں کے لئے اسلامی سزا کے طور پر چورا ہے پر کوڑے مارنے کے بارے میں ہوتی ہیں، جن کا ہر جمعے کے دن ٹی وی پر اعلان کیا جاتا ہے: ایک شرابی نے شراب کے نشے میں دوسرے شرابی کو مار ڈالا؛ دوسرے نے اپنی ایک رشتہ دار کی عزت لوٹ لی؛ تیسرے نے کار سے کسی اجنبی کو کچل ڈالا۔ وہ اتنی کم عمری میں بیوہ ہونا نہیں چاہتی۔ اس کی اور اس کے بچوں کی کفالت کون کرے گا؟

وہ ٹی وی پر ایک اداکارہ کی چیخنے سے گھبرا کر جاگ گئی۔ کیا وہ سو گئی تھی؟..... کیا وہ خواب دیکھ رہی تھی؟..... وہ ٹی وی والی اداکارہ پر چلانے لگتی ہے جیسے وہ اس کی بات سن ہی لے گی، ''خدا تمہاری آواز کو غارت کرے!''

پھر اس نے دیوار پر لگے ہوئے کلاک کی طرف دیکھا۔ ایک بج گیا۔ وہ اچھل کر صوفے سے کھڑی ہو گئی، کمرے اور لاونج میں ادھر سے اُدھر ٹہلنے لگی۔

کہیں اسکی کار بے قابو ہو کر سڑک سے اتر تو نہیں گئی؟ یا شاید اسے ایک کالی بکری اور بجلی کے کھمبے میں جس کا بلب فیوز ہو گیا ہو کوئی فرق نہیں لگا ہو گا۔ ''یا اللہ! جب وہ گھر سے باہر ہوتا ہے تو رات کیوں اتنی لمبی ہو جاتی ہے۔''

''وہ'' ہمیشہ صیغہ واحد غائب بن جاتا ہے۔ چاہے وہ سامنے ہی کیوں نہ موجود ہو۔ ''وہ'' ہی مکان کرائے پر لیتا ہے، گھر کا سامان لاتا ہے، ہم سب کی ''حفاظت'' کرتا ہے۔ حالانکہ وہ خوب جانتی ہے کہ اس روتے دھوتے شرابی سے کون ڈرے گا۔

اسکی پریشانی بڑھ رہی تھی اور خون جل رہا تھا۔ وہ انتظار اور گھبراہٹ میں ہاتھ مل رہی تھی، انگلیاں چٹخا رہی تھی۔ دروازے پر قدموں کی آہٹ ہوئی۔ وہ دروازے میں چابی لگانے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ دروازہ ایک جھٹکے سے کھل گیا۔ اسکے اندر آنے سے پہلے جو بُو اندر آتی ہے وہ اس سے ہی ڈرتی ہے۔ اس نے زور سے درواوزہ بند کیا۔

''تم کیوں یہاں چور کی طرح چھپی کھڑی ہو۔'' وہ پوچھتا ہے۔

''ہاں، ہاں تمھیں تو یہ کہنے کا حق ہے۔ مگر کیا تمہارے خیال میں کوئی چور تم جیسے آدمی سے ڈرے گا جو لڑ کھڑاتا ہوا اپنے گھر واپس آتا ہے۔''

''چپ رہو'' وہ چلایا۔

اس نے بھی غصے میں کچھ کہا۔

''تم مرد نہیں ہو۔ اگر مجھے اپنے ابّا کے ڈنڈے کا ڈر نہ ہوتا تو........تو میں تم سے کبھی شادی نہ کرتی۔''

وہ سوچ رہی تھی کہ ہمیشہ کی طرح وہ اس کے گھٹنے پکڑ کر روئے گا۔

مگر اس بار اس نے دانت بھینچ کر ہاتھ اٹھایا اور اس کے منہ پر ایک تھپڑ مارا۔ جب وہ ڈر کر پیچھے ہٹی تو ایک ٹھوکر مار کر چل دیا۔

جب اس نے کار اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی تو سوچا کہ کہیں وہ نشے میں بجلی کے کھمبے سے ٹکرا کر ختم نہ ہو جائے۔ وہ بیوہ ہو جائے گی، بچے یتیم ہو جائیں گے۔ وہ محبت سے عاری ازدواجی زندگی جینے سے نفرت کرتی ہے مگر یہ بچوں کے ساتھ بیوگی کی محتاجی کی زندگی سے تو بہتر ہے۔

وہ دروازہ کھول کر اس کے پیچھے جاتی ہے۔ کار کی پچھلی بتیاں فٹ پاتھ سے دور ہوتی دکھائی دیں اور پھر کار نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

☆☆☆

ایک پریشاں بگولہ

امل عبدالحمید

بہت دنوں سے میں اپنے دکھوں کے بارے میں لکھنے کی کوشش کر رہی ہوں تا کہ بتا سکوں کہ میں نے کیا کیا سہا ہے۔ مگر میرے خیالات اپاہج ہو گئے ہیں۔ کاش مجھ میں ہمت ہوتی اور میں اپنی کمزوری اور تضحیک کی چہار دیواری کو توڑ سکتی جس نے مجھے قیدی بنا رکھا ہے۔ میں اپنے ماضی میں زندہ رہنا چاہتی ہوں تا کہ حال سے فرار حاصل کر سکوں۔

وہ گذرا ہوا زمانہ جب میں سولہ سال کی تھی۔ میری ماں نے مجھے خود اعتمادی سکھائی تھی، مجھے پسند یا ناپسند کی آزادی دی تھی۔

میری زندگی کے شب و روز خوشی اور غم، امید و ناامیدی کے درمیان جھولتے تھے۔ میرے پڑھنے کے شوق نے دوستوں کی کمی کا ازالہ کر دیا تھا۔ میرے بہن بھائی مجھ سے بہت بڑے تھے لہذا ان سے قربت و تعلق کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ میں تنہائی پسند تھی، اپنے کمرے میں رہتی تھی، بہت کم باہر آتی تھی۔

بہر حال ہمارے نئے پڑوسی کی بیٹی میری دوست بن گئی۔ میں اور منیٰ روز ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ جب وہ میری کلاس فیلو بھی بن گئی تو یہ دوستی اور پکی ہو گئی۔

ایک دن منیٰ اور اس کی اماں غیر متوقع طور پر ہمارے گھر آئیں۔ میری ماں کافی دیر تک منیٰ کی ماں سے سرگوشیوں میں گفتگو کرتی رہیں۔ میں نے سوچا کہ شاید وہ کچھ ادھار مانگنے آئیں ہیں یا اور کوئی ضرورت آن پڑی ہے۔ میرا اندازہ صحیح ہی لگ رہا تھا کیونکہ اماں نے ابا سے بھی کچھ سرگوشیوں میں کہا۔ مگر بعد میں ابآ

نے مجھ سے کہا ''تمہاری دوست کا بھائی تم سے شادی کرنا چاہتا ہے''۔ میں اس خبر سے بالکل حیران رہ گئی۔

میرے ابا نے تذبذب کے لہجے میں پھر کہا ''تم ابھی کم عمر ہو شادی کی ذمہ داری اٹھانی مشکل ہو سکتی ہے''۔ اس جملے میں مجھے ایک چیلنج لگا، مجھے خطرے مول لینا اچھا لگتا تھا، ایک نئی دنیا میں داخل ہونا چاہتی تھی، نئے تجربے کرنا چاہتی تھی۔ میں نے سوچا کہ مجھے منیٰ کے قریب رہنے کا موقع بھی ملے گا۔

جلد ہی میری احمد سے شادی ہو گئی اور میں اپنے نئے گھر ایک نئی دنیا بسانے چلی گئی۔ مگر میں اس اڑتی چڑیا کی طرح تھی جسے معلوم نہیں تھا کہ اسے زمین پر کہاں اترنا ہے۔ کچھ ہی دن بعد مجھے تنہائی اور اجنبیت کا احساس ہونے لگا۔ خاص کر جب منیٰ بھی اپنی شادی کے بعد گھر سے چلی گئی۔

ایک سال گذرا تھا کہ میری ساس مجھے باتیں سنانے لگیں، طعنے دینے لگیں۔ وہ کہنے لگیں کہ ان کے دوسرے بیٹوں کے طرح میرے یہاں بھی بچے ہونے چاہیئں۔ احمد کا لحاظ کرتے ہوئے میں کوئی جواب نہیں دیتی تھی۔ وہ میری ہمت بندھاتے تھے، مجھے دلاسہ دیتے تھے۔ مگر بچے کے لئے خود ان کی چاہت نے مجھے سنجیدہ کر دیا تھا، میں اپنے شوہر اور ان کی ماں کو ایک بچہ دینا چاہتی تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ مجھ سے دور ہو جائیں یا ہماری ازدواجی زندگی میں کوئی اور عورت ساجھے دار ہو جائے۔ بے بسی سے اپنے خواب کو بکھرتا ہوا دیکھنا بہت مشکل تھا۔ میری دوست منیٰ تک مجھے خود غرضی کا الزام دینے لگی اور کہا ''تمہاری شادی کو پانچ سال ہو گئے مگر اب تک اس کا پھل ہم لوگ نہیں پا سکے۔ مجھے دیکھو میں اپنے چوتھے بچے سے حاملہ ہوں''۔

میری زندگی دکھ اور ناامیدی کی راہ پر چل نکلی تھی۔ کبھی ایک جنگلی جانور کی طرح سب کچھ تہس نہس کر دینے کو جی چاہتا تھا مگر پھر کم ہمتی مجھ پر غالب آجاتی تھی۔ آخر کار میں نے اپنے ضدی غرور پر قابو پالیا اور اس مسئلے کے حل کے لئے کچھ

کرنے کی ٹھانی۔ میں اپنی ساس کی تلخ باتوں اور شکایت بھری نگاہوں سے جو میرا پیچھا کرتی رہتی تھیں بہت تھک چکی تھی۔ ایک دن جب احمد کام سے واپس آئے تو میں نے اپنے آنسو چھپاتے ہوئے کہا ''میں نہیں چاہتی کہ مزید ایک بھی دن بھی تم اس چیز کے لئے ترسو جس کا ارمان تمہارے دل میں ہے مگر تم اس کا اظہار نہیں کرتے کہ میرے دل کو ٹھیس پہنچے گی۔ تم میرا سامنا کرنے سے بھی کترانے لگے ہو کیونکہ میں تمہارے ان کہے جذبات کو خوب سمجھتی ہوں۔ میں تم کو آزادی دیتی ہوں جو چاہے کرو۔ تم بچوں کیلئے دوسری شادی کر سکتے ہو۔ یہ ہی بہترین حل ہے، تم میرے پابند نہیں ہو۔''

''ہاں، دوسری شادی ہی کرنی ہوگی'' احمد نے دبے لہجے میں کہا۔

ایک چیخ سی میرے اندر گھٹ گئی۔ میری روح کانپ اٹھی۔ پھر وہ مجھے اپنے والدین کے گھر میں چھوڑ کر اپنی نئی ملازمت پر ریاض چلا گیا۔ میرے دن بوریت میں گذرتے رہے، ذہن پریشان رہتا تھا۔ وقت تنہائی کا بھوت بن کر میرے گرد چکر کاٹتا رہتا تھا۔ اپنی بدنصیبی کا بوجھ لئے میں اپنی ماں کے پاس پہنچی تھی جو ان دنوں بیمار پڑی تھیں۔ میں ان سے لپٹ کر بہت روئی مگر انھوں نے بہت نارمل لہجے میں کہا،

''ایسا تو نہیں کہ وہ دنیا کا پہلا بے اولاد آدمی ہے۔ حقیت ایک سیدھا پل ہے اسے ہمت سے پار کرو۔ کسی کام میں لگو، تعلیم حاصل کرو، نوکری کرو۔''

یکا یک میں ان الجھنوں سے آزاد ہو گئی جن کی دھند میں مسائل کا حل میری نظروں سے چھپ گیا تھا۔ میں نے دوبارہ زندگی شروع کی مگر مجھے پہلے سے زیادہ جدو جہد کرنی پڑی۔ ہمت اور لگن کے ساتھ میں نے مصروفیات ڈھونڈ لیں، تعلیم حاصل کی اور نوکری بھی تلاش کر لی، مجھے اسکول میں پڑھانے کی ملازمت مل گئی۔ مصروفیت نے میری تنہائی دور کر دی۔ میرے شوہر نے اس تمام عرصے میں پلٹ کر بھی نہیں دیکھا کہ میں کیا کر رہی ہوں۔

ایک دن جب میں کام سے واپس آئی تو میری ساس غصے میں بھری اپنے کمرے کے سامنے میرا انتظار کر رہی تھیں، کہنے لگیں،

''یہ گھر تو لوگوں کے لئے ایک ہوٹل بن کر رہ گیا ہے۔کوئی احترام ہی نہیں ہے۔گھر میں کوئی مرد نہیں ہے اس لئے تم اپنی من مانی کرتی ہو''۔

بہت ہو گیا تھا ان سے دب کر، ڈرپوک بن کر رہنا، میں بھی پھٹ پڑی،

''ہاں کرتی ہوں من مانی۔ گھر کا مرد کہاں ہے؟ اسے گئے ہوئے دو سال ہو گئے۔ جایئے اسے ذمہ داری اور احترام پر لکچر دیجئے۔ میں نے کوئی شرمناک کام نہیں کیا ہے۔میں اسلئے کام کرتی ہوں تا کہ خود کفیل ہو سکوں۔آپ مجھ سے کیوں خفا ہیں، میں تو آپ کے پاس ہی ہوں پھر آپ کو کیا تکلیف ہے۔ زندگی کی بہت سی مشکلات میں جھیل چکی ہوں اب تو مجھے سکون سے رہنے دیجئے''۔

میں تیزی سے بڑھی جیسے کوئی پاگل عورت جو زنجیروں سے آزاد ہو گئی ہو، اور اپنا سامان پیک کرنے لگی۔دنیا کی ساری سیاہی میری آنکھوں میں سما گئی تھی۔

تب میں نے ان کی (احمد کی) آواز سنی ''کہاں جا رہی ہو؟''

میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''اپنے میکے''۔

انھوں نے کہا ''تم خفا کیوں ہو؟ میرے ہاتھ میں تو کچھ نہیں تھا۔میرا تبادلہ ہو گیا تھا''۔

''مجھے پرواہ نہیں، میں اپنے گھر جا رہی ہوں، یہ گھر نہیں ہے، مجھے لگتا ہے کہ میری یہاں کوئی جگہ نہیں ہے۔تمہارے خوابوں میں جب کبھی میں آ جاتی ہوں تو تم کبھی کبھار مجھ سے مل لیتے ہو۔ ورنہ میں تو تمہارے لئے بس ایک خیال ہوں جو کبھی کبھی تمہارے لبوں پر مسکراہٹ لے آتا ہے۔ تمھیں ایک پل میری یاد بھی آتی ہے تو تم خود سے سوال کرنے لگتے ہو کہ مجھے اس کی کیا ضرورت ہے جب کہ وہ مجھے باپ نہیں بنا سکتی؟ تم مجھے احساس دلاتے رہتے ہو کہ میں قصوروار ہوں۔ میں اس آدمی کی طرح ہوں جو صحرا میں دوڑ رہا ہو اور اچانک رک کر اس آواز کی سمت کا تعین کرے جو کہیں دور سے آنے والی آوازوں کی گونج میں کھو گئی ہو۔تمہاری چاہ مجھے بار بار صبر کی آخری حدوں تک لئے گئی۔تم نے سوچا کہ میرا رول تمہاری زندگی میں ختم ہو گیا ہے۔

تم نے مجھے ناامیدی کے بگولوں میں دھکا دے دیا۔ اگر میں تمھیں بچہ نہیں دے سکتی تب بھی کچھ ازدواجی حقوق و فرائض ہوتے ہیں، ان کا بھی پاس ضروری ہے۔ میں چاہتی تھی کہ تم آزادی سے ان حقوق فرائض کو پورا کرسکو۔ تمھیں معلوم نہیں کہ میں تمھیں کتنا چاہتی ہوں؟ قوت تولید اللہ کا تحفہ ہے اگر اس نے مجھے یہ تحفہ نہیں دیا تو کیا میں خود کو ختم کرلوں؟

میں نے خود کو سنبھالا اور جانے لگی۔ مگر اس نے مجھے گلے لگالیا اور کہتا رہا ''میری جان! مجھے معاف کردو، اللہ بھی مجھے معاف کردے گا۔''

☆☆☆

عکس

خیریہ السقاف

بس ایک امید میں جی رہی ہوں کہ آسمان سے روشنی کے راستے آکر خدا کی طرف سے کوئی ان ہونی مجھے بچالے گی۔ جب ہر شے ساکت ہوتی ہے تو میں خوفزدہ ہو جاتی ہوں۔

کوئی سورما شہزادہ اک سرمئی گھوڑے پر سوار آئے گا اور مجھے وہاں لے جائے گا جہاں سندباد اپنی محبوبہ ایرا کو وحشیوں کے چنگل سے چھڑا کر، لکڑی کے گھوڑے پر بٹھا کر لے گیا تھا، دور بہت دور۔ مگر میں اب بھی وحشیوں میں گھری ہوئی ہوں جنھوں نے مجھ سے اپنے فیصلے خود کرنے کی آزادی چھین لی ہے، جو میری ہر بات کو کنٹرول کرتے ہیں۔ وہ میرے آنسوؤں اور مسکراہٹوں کے مالک ہیں، وہ میرے کھانے تک کا حساب رکھتے ہیں۔ تو پھر یہ کوئی شرمناک بات تو نہیں کہ میں ایک سورما شہزادے کے خیال میں گم رہتی ہوں۔

''اے! سنو'' کہیں سے کوئی مجھ سے کہتا ہے۔ شاید یہ میرا لاشعور ہے یا کچھ اور ہے۔

''تم جس شہزادے کے بارے میں سوچتی ہو وہ تو بس فرضی داستان ہے۔ آج کا زمانہ سورما شہزادوں اور گھوڑوں کا نہیں ہے۔ تم کو معلوم ہے کہ ایسے سورما شہزادے کہاں گئے۔ وہ تو گھوڑوں کی ٹاپوں تلے روندے گئے، جب وہ تمہارے اپنے لوگوں کے گھر کی دیوار پھاند کر نکلنا چاہ رہے تھے۔''

میں خود کو جواب دیتی ہوں، ''کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں ذرا سی دیر اپنے

خواب میں مگن ہو جاتی ہوں تم میرے خواب بھی چھیننے لگتی ہو"

وہ آواز پھر مجھ پر پھر حاوی ہو جاتی ہے۔"اے سنو! یہ سب تمہارے ہی گھر کے لوگ ہیں۔ مُنّی، تمہارے باپ، ماں، بھائی۔"

"اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ ان میں اور چوروں میں کچھ فرق نہیں ہے۔ حالانکہ یہ لوگ اس قسم کے طریقے استعمال نہیں کرتے مگر ان کا مقصد تو آخر کار وہی ہوتا ہے۔

میں گھبراہٹ میں اپنے کمرے کا چکر لگا رہی ہوں اور پھر سنگھار میز اور پڑھنے کی میز کے درمیان پڑی ایک کرسی میں گر جاتی ہوں، کمرے کے بیچ بچھی ہوئی چھوٹی سی قالین کو تکتی ہوں جس پر میرے کچھ کاغذات بکھرے ہوئے ہیں۔ بند کھڑکی دبیز پردوں میں چھپی ہوئی ہے۔ ایک مکھی کمرے کا چکر لگا رہی ہے جیسے یہاں سے باہر نکلنے کا راستہ ڈھونڈ رہی ہو۔ وہ میری ناک پر آبیٹھتی ہے۔ میں اسے ہاتھ سے اُڑاتی ہوں،

"کم بخت، تم کو بھی اسی وقت مجھے پریشان کرنا رہ گیا تھا؟"

گھر میں غیر معمولی سی ہلچل ہے، میرے دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ میرا بھائی خالد اندر آتا ہے۔"ابا پوچھ رہے ہیں تم کیا اس سے شادی کرنے پر راضی ہو؟"

میں گھبرا کر جواب دیتی ہوں "نعم! ہاں"

میرا بھائی خوشی سے اچھل پڑتا ہے اور تیزی سے باہر چلا جاتا ہے۔

میں اپنے چار بہن بھائیوں میں چوتھے نمبر پر ہوں۔ میرے تین بھائی ہیں۔ خالد، محمد اور ماجد۔ میرے اماں ابا مستقل لڑتے رہتے ہیں۔ اکثر پڑوسی ان کی چیخ پکار سنتے رہتے ہیں۔

مجھے وہ دن یاد ہے جب اماں غصے میں گھر سے نکل گئیں تھیں۔ ہم چاروں ان کا عبایہ پکڑ کر ان کے پیچھے چلنے لگے۔ انھوں نے کہا تھا،

''دفع ہو کتے کے بچوں! میں جا رہی ہوں، جہنم میں جاؤ، مجھے اکیلا چھوڑ دو۔''

کچھ گھنٹوں بعد جب ڈھلتا سورج زمین کو مریض کی طرح پیلا چھوڑ کر جا رہا تھا، دروازے پر دستک ہوئی۔ ہم نے پردے سے جھانک کر دیکھا۔ ہمارے نانا اور ماموں پڑوسیوں کے بچے، اور ان کے پیچھے ہماری خالائیں اماں کو دونوں طرف سے گھیرے ہوئے موجود تھے۔ وہ قافلہ جنازے کی طرح خاموش۔ تھوڑی ہی دیر میں اماں کی آہ وزاری بلند ہو چکی تھی، ابّا اول فول بک رہے تھے۔ سب لوگ چلے گئے سوائے ایک خالہ کے جو اماں کے پاس جا کر للکاری ''تم پیچھے مت ہٹنا، خبردار، تم سخت ہو جاؤ۔''

خالہ چلی گئیں، وہ واقعی فتنہ پھیلانے والی تھیں۔ اس گھر میں کبھی چین وامن نہیں رہا۔

میری ماں اپنے کتے اور پلوں کے پاس واپس آ گئیں تھیں۔

میرے بھائی گھر میں آتے ہیں جاتے ہیں، میں انکے ناموں کے علاوہ ان کے بارے میں اور کچھ نہیں جانتی۔

''یا خالد! مجھے پین اور کاپی چاہیے'' میں کہا کرتی تھی۔

کوئی جواب نہیں۔

''یا محمد! مہربانی کر کے مجھے اپنی دوست سے ملنے جانا ہے، پلیز اس کے گھر تک چھوڑ آؤ۔''

''واللہ! وہی عورتوں کی حماقتیں، گھر میں رہنا سیکھو، تمھیں گھر سے باہر نہیں گھومنا چاہیے۔''

''یا ماجد! چھوٹے بھیا! میرے پاس آ کر بیٹھو، باتیں کریں گے''

خاموشی.....

میرے ابا نے مجھے کبھی پیسے نہیں دئے۔ میں نے اپنی ہم جماعت کے

اسکول بیگ میں سے کچھ پیسے چرا لئے تھے جس سے میں نے ایک بڑی سی فٹ بال خریدی تھی اور پلنگ کے نیچے چھپادی تھی۔

میرے ابا بھی ایک معمہ ہیں۔ میں اپنے باپ کو بس ان کے کا غصہ سے جا نتی ہوں اورانکا وہ ہاتھ جانتی ہوں جو میں صبح شام چومتی ہوں ورنہ میرا جسم آگ سے داغا جائے گا اور میرا سارادن جہنم بن جائے گا۔ مجھے ہمیشہ اپنی انگلیوں کی پوریں جلتی ہوئی لگتی ہیں۔

میرے ابا صرف اتنی ہی بات کرتے ہیں '' یہ لو میرے کپڑے، دھولاؤ۔'' یا چلانے لگتے ہیں '' کیا مصیبت ہے، جب بھی میں تمہارے کمرے میں آتا ہوں تو تم کتابیں پڑھتی ملتی ہو۔'' پھر وہ کتابیں میرے ہاتھ سے چھین کر، پھاڑ کر پھینک دیتے ہیں۔ باکل اسطرح جیسے وہ میری روح اور میرے جذبات کے ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہیں۔ پھر وہ مجھے حکم دیتے ہیں جاؤ جا کر صفائی کرو، کھانا پکاؤ، ہنسو مت، یہ پہنو یہ مت پہنو۔

میں گھر سے نکل کر اپنی اسکول کی ساتھیوں کی طرف بھاگتی ہوں۔ ان کم سن لڑکیوں کو اپنی دوستیوں، شرارتوں اور کھیل کود کے علاوہ اور کچھ نہیں سوجھتا۔

حفعہ لاڈ پیار میں پلی ہے۔ اسکی ماں اسکی بات سنتی ہے، باپ اس سے ہمدردی رکھتا ہے۔ وہ کسی بدکلامی اور بدسلوکی کا شکار نہیں ہے۔

غدا کھلنڈڑی ہے۔ میں اس سے ملنا نہیں چاہتی۔

سواد، فتیحہ، جوہرہ اور دوسری لڑکیاں پڑھائی میں بہت اچھی ہیں۔ ان کے والدین پڑھائی میں ان کی ہمت افزائی کرتے ہیں۔

ایک دن جب میں اسکول سے نکلی تو میرے اندر کی آواز نے مجھے جھنجھوڑ دیا۔ '' تمہارے ساتھ کچھ نفسیاتی مسئلے ہیں..... مسئلے......''

ایک اور آواز مجھے بلا رہی تھی '' ہمارے ساتھ کہیں بھی چلو، چلو اپنی جوانی کا

مزہ لیں، چلو ہنسیں، ناچیں، جو دل چاہے کریں۔''

ایک تیسری آواز نے کہا'' ہم تم کو سمجھ نہیں پاتے، تم عجیب ہو۔ اپنے اسکول کے کام میں جی لگاؤ سارے مسائل حل کرلو گی۔''

میں نے احتجاج کیا'' لیکن اگر تم میرے گھر آؤ تو پتہ چلے گا کہ مجھ پر کیا گذرتی ہے۔ تم نے تو میری پریشانیاں اور بڑھا دیں۔ تم نے مجھے توڑ کر رکھ دیا ہے۔ تم نے میری بچی کچھی خود اعتمادی بھی چُور چُور کردی۔ تم نے کوشش کی کہ میں منحرف ہو جاؤں یا آسمان کی بلندی کی طرف دیکھوں مگر تم دونوں ہی میں ناکام ہو۔ میں ناکام ہوں..... میرے حالات ساتھ نہیں دیتے۔ میرا خاندان مجھے گھیرے ہوئے ہے۔ میری دنیا لالچ اور برائی سے بھری ہے۔'' اور اسی دن میں نے شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ کسی بھی شہزادے کو قبول کرنے کا فیصلہ جو میرے دروازے پر دستک دے گا۔

تب میری ماں اندر آئی اور کہا'' چلو، مُنّی اپنے سب سے اچھے کپڑے پہن لو۔''

وہ مجھ سے اتنی نرمی سے کیوں بول رہی ہیں، وہ تو مجھ سے اس طرح نہیں بولتیں۔ شاید وہ خود سے کہہ رہی ہوں'' جب یہ گھر سے چلی جائے گی تو اخراجات کم ہو جائیں گے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ میں اس کے باپ کو چھوڑ کر جا سکوں۔ باقی لڑکے ہیں میں ان کا خیال رکھوں گی۔''

جب میں نے باہر جا کر اپنے ہونے والے دولہا کو دیکھا تو جھٹکا سا لگا۔ وہ بہت بدصورت تھا۔ بوڑھا، سفید بالوں والا، آنکھیں موٹے سی عینک کے پیچھے سوتی ہوئی........ بلکہ اس کی آنکھیں چشمے کے پیچھے سے نظر ہی نہیں آرہی تھیں۔ اسکے بڑے بڑے ہاتھ سخت اور کھردرے تھے۔

''فکر مت کرو مُنّی'' میرے اندر کی آواز ے ،، ؛ت یہ ہے کہ تم اس گھر سے نکل جاؤ۔''

اپنے نئے گھر میں پہلے دن جب میں نے اسکی طرف دیکھا تو بہت روئی۔ اس کی بھاری سی آواز میرے کان میں پڑی ''تم کیوں رو رہی ہو، میری دلہن؟''

''کچھ نہیں'' میں نے کہا

(کچھ نہیں کیوں؟ وہ بالکل بھی شہزادے جیسا نہیں تھا۔ میں نے تم سے ایک بار نہیں کہا تھا کہ یہ زمانہ گھوڑے پر سوار شہزادوں کا نہیں ہے؟)

اس نے پھر دہرایا ''تم کیوں رو رہی ہو مُنّی؟''

''مجھے اپنے ماں باپ کی یاد آرہی ہے۔'' (تم جھوٹ بول رہی ہو، تمہارا خواب پورا نہیں ہوا، بس یہ بات ہے۔)

اس نے تیسری بار دہرایا ''او مُنّی! تم کیوں رو رہی ہو؟''

''تمھیں پتہ نہیں میں کیوں رو رہی ہوں؟''

''نہیں۔''

''اپنی قسمت کو رو رہی ہوں۔''

''انشااللہ، میرے ساتھ تمہاری قسمت اچھی ہے۔''

''انشااللہ۔''

میں اس رات سوئی نہیں۔ میں اور زیادہ تاریک مکان میں چلی آئی تھی۔ کہیں چڑیاں نہیں ہیں، باغ نہیں ہے، خوشبودار پھول نہیں ہیں۔

کوئی شہزادہ نہیں ہے، گھوڑے کی ہنہناہٹ تک نہیں ہے۔ کوئی گلاب رات نہیں جس میں آوازیں، ہنسی اور خوشبو گھلی ہو۔ بس یہ بے رونق مکان ہے۔

میں کتنی بار دن میں روئی، ساری رات روئی مگر کسی نے دیکھا تک نہیں۔ کتنی بار ڈھونڈا کہ کوئی مجھے سمجھنے والا مل جائے، میرا سہارا ہو۔

اسکول ....اسکول میں مجھے دوستیں اور استانیاں مل سکتی ہیں جو مجھے سمجھتی ہیں۔

موٹا، سفید مونچھوں والا بوڑھا ننگے پیر کمرے میں داخل ہوا۔اس کا چہرہ سر کے رومال (غترے) میں چھپا ہے۔درشتی سے کہا،

''اٹھو مُنیٰ، کھانے کا انتظام کرو۔کچھ مہمان آئے ہیں۔''

''اچھا جناب۔''

میں جھک کر پلنگ کے نیچے سے اپنے چپل نکالنے لگی۔ایک ڈھونڈ لیا مگر وہ ہاتھ سے پھسل گیا۔

مجھے ٹھوکر مار کر بوڑھا چلایا،''میں نے کہا فوراً!''

میں اسکی طرف دیکھ کر چلائی،''رک جاؤ، بہت ہو گیا! مجھے مار کیوں رہے ہو؟''

بوڑھا مجھے مارنے لگا اور چیخا''میں تمھیں طلاق دیتا ہوں۔''

میں بس اپنی بیٹی اور اپنا عبایہ (برقعہ) وہاں سے لے کر نکل آئی ہوں۔وہاں کوئی اور چیز ساتھ لے جانے کے قابل ہی نہ تھی۔مجھے اب کسی چیز کی پرواہ بھی نہیں ہے۔مجھے بس تازہ ہوا چاہئے۔میں تیزی سے سڑک پر نکل آئی،آنکھوں سے آنسوؤں کے دریا بہہ رہے ہیں۔

میرا نیا''باپ'' بھی پرانے والے کا عکس ہے۔فرق یہ ہے کہ یہ مجھے زیادہ مارتا ہے، زیادہ تضحیک کرتا ہے اور اس سے بھی زیادہ بوڑھا ہے۔ایک دن میں نے اپنی شادی کا جوڑا نکال کر کھڑکی سے باہر کوڑے کے ڈھیر میں پھینک دیا۔اپنے بال سمیٹ کر سر ڈھک لیا، تمام عطر کی شیشیاں توڑ کر پھینک دیں۔اپنی سنگھار میز سے اٹھا کر سارا میک اپ کا سامان پھینک دیا۔

میرا بدنصیبی اور مصیبت کا سفر جاری ہے۔لمبے راستے مجھے نگل رہے ہیں۔

میں اپنے آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی ہوں۔

بھیڑ میں کہیں دور پیچھے سے ایک بھاری آواز مجھے سنائی دیتی ہے، مُنّی رک جاؤ!"..........

مجھے چکر آرہے ہیں، سر میں درد ہے، قے آرہی ہے، میں تھک کر سڑک پر گر جاتی ہوں۔ پیروں تلے دب کر غائب ہوجاتی ہوں۔

☆☆☆

تیسرا حصّہ

میں واپس نہیں آؤں گی

قماشہ العلیان

مریم کومعلوم تھا کہ ابراہیم اس سے بے وفائی کر رہا ہے مگر وہ خاموش رہی۔ وہ بہت آگے جاچکا تھا اور جانتا تھا کہ مریم سب کچھ جانتی ہے۔ ان کی شادی ایک لمبی محبت کی کہانی کے بعد ہوئی تھی۔ یکطرفہ محبت، مریم کی طرف سے۔ جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا وہ ابراہیم سے محبت کرتی تھی۔ وہ اس کا کزن تھا، ایک ہینڈسم نوجوان۔ وہ ہی اکیلی اس کی محبت میں گرفتار نہیں تھی، خاندان کی اور باہر کی بہت سی لڑکیاں اس سے محبت کرتی تھیں۔ وہ ہر لڑکی کا خواب تھا، ہر کنواری لڑکی کی امید اور ہر لڑکی کی ماں کی خواہش۔ ہینڈسم ہونے کے ساتھ ساتھ ہر جگہ کامیابی اس کے قدم چومتی تھی۔ اسکول میں، اپنے والد کا کاروبار چلانے میں، سوشل تعلقات میں وہ ہر جگہ کامیاب تھا۔ مریم اس سے محبت کرتی تھی مگر کبھی اس نے ابراہیم کو اپنی طرف متوجہ کرانے کی کوشش نہیں کی، اپنے دل کا حال اس نے ابراہیم پر رتی بھر بھی نہیں عیاں ہونے دیا۔ اسکی سہیلیاں اس سے اصرار کرتی تھیں کہ وہ اسے فون کرے مگر اس نے انکار کر دیا اور اس جذبے کو اپنے دل تک ہی رکھا۔ بعض لڑکیوں نے اسے فون کیئے، کسی نے خط لکھے، کسی نے میوزک کے کیسٹ بھیجے اور کچھ تو ایسی بھی تھیں جو اس کے ساتھ باہر بھی گئیں۔ بہت سی لڑکیاں تھیں اس لئے مریم نے کوئی امید بھی نہیں باندھی تھی اور خاص کر جبکہ وہ دوسروں کیطرح اپنی محبت کا اشتہار نہیں چاہتی تھی۔ مریم جانتی تھی کہ وہ ان میں سے زیادہ تر لڑکیوں کی طرح خوبصورت نہیں ہے۔ وہ ہائی اسکول سے زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہے، اس کا کوئی کیریئر نہیں ہے۔ مگر وہ خود، اور گھر کے سب لوگ

حیران رہ گئے جب ابراہیم نے شادی کے لئے اسکا ہاتھ مانگا۔ ہاں اس کا، اور کسی لڑکی کا نہیں۔

وہ کچھ بول ہی نہیں پا رہی تھی۔ اسکی ماں نے دوسری بار اس سے پوچھا،

''مریم! تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ تم ابراہیم سے شادی کرنے پر رضامند ہو؟''

بڑی مشکل سے الفاظ اس کے لبوں پر آئے'' جیسا آپ سمجھیں، میں کیا جانوں''۔

اسکی ماں کی باچھیں کھل گئیں۔ اپنی بیٹی کی ہچکچاہٹ کو اس نے ایک نوجوان لڑکی کی شرم اور حیا ہی جانا۔

مریم نے دروازہ بند کرلیا اور ہر چیز کو ایسے دیکھنے لگی جیسے پہلی بار دیکھ رہی ہو۔ دروازے، کھڑکیاں، اپنا بستر، اپنا تکیہ، اپنے کپڑے، ہر چیز مختلف لگ رہی تھی، ہر چیز جیسے جادو سے بدل گئی تھی۔ زندگی بس مسرت اور شادمانی تھی۔ مگر نہیں، وہ خوش نہیں ہو سکتی جب تک یہ معلوم نہ ہو جائے کہ اس نے دوسری لڑکیوں کے مقابلے اسے کیوں چنا، کوئی تو وجہ ہوگی۔

مگر پھر وہ اپنی سرخوشی میں سب کچھ بھول گئی۔ یہ ہی کافی تھا کہ ابراہیم نے اسے منتخب کیا۔ شادی کے دن مریم کی آنکھیں اسے دیکھ کر خوشی سے چمک رہی تھیں۔ مگر کچھ تکلیف دہ استہزائیہ فقرے، طنزیہ ہنسی بھی اسکے کانوں تک پہنچی۔

کسی نے کہا،

''یہ تو بالکل اس لڑکے کے قابل نہیں ہے، شکل تو دیکھو۔''

اس نے ایک ماں کو اپنی بیٹی کو ڈانٹتے سنا،

''تم نے اسکی ذہانت دیکھی؟ وہ خوبصورت بھی نہیں ہے مگر اس نے سب کچھ جیت لیا''۔

مریم سر فخر سے بلند کئے اپنے ہینڈسم دولہا کا ہاتھ تھامے چلی گئی۔

پہلی رات اس نے اس سے پوچھا ''تم نے مجھے کیوں چنا، جب کہ اور بہت سی تھیں؟''

وہ ایک لمحہ تو خاموش رہا پھر بولا،

''شاید تم ہی تھیں جو مجھے نہیں ملی تھیں۔ صرف تم ہی تھیں جس نے مجھ پر اپنا جال پھینکنے کی کوشش نہیں کی۔ تم ہی تھیں جس کی انگلی تک میں نے شادی کی رات تک نہیں دیکھی تھی''۔

دن گذرتے گئے، وہ اس کے مزاج کو، ہر جذبے اور احساس کو سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔ اپنی سادگی کے باوجود اس نے ابراہیم کی زندگی میں شامل ہونا چاہا، اس کے دل تک پہنچنے کی کوشش کی۔

مگر جلد ہی وہ اپنی پرانی عادتوں پر لوٹ آیا۔ جہاں وہ جاتا لڑکیاں اس کو گھیرے رہتیں۔ ان میں سے کئی تو کافی کھُل کھیلیں، شاید اس کی بیوی کو چڑانے کے لئے؟

وہ خاموش رہی مگر اس کے اردگرد کے لوگ باتیں کررہے تھے، وہ اس کے شوہر کی جنسی فتوحات کے بارے میں سرگوشیاں کرتے، پھر سرگوشیاں بلند ہونے لگیں، اس کے سر پر شور مچانے لگیں۔ ''تمہارا شوہر تم سے بے وفائی کررہا ہے۔''

اسکی خاموشی اور گہری ہوتی گئی مگر تب بھی وہ ایک اچھی بیوی کی طرح ہی رہی۔ بلکہ اس نے اور بھی کوشش کی کہ اس کو اپنی اور گھر کی محبت کی طرف مائل کرسکے۔

ایک دن اس کی ماں نے دھیرے سے کہا کہ اولاد مرد کو گھر سے قریب لے آتی ہے۔ اس کا پہلا بیٹا ہوا، پھر دوسرا اور پھر ایک لڑکی۔ مگر ابراہیم کو کوئی بندھن اس سے نہیں باندھ پایا۔

وہ بیرونِ ملک گیا اور لڑکیوں کے ساتھ تصویریں کھنچوا کر لایا جنھیں دیکھ کر اس کا دل ڈوبنے لگا مگر وہ مفلوج سی ہوگئی تھی، وہ اسے چھوڑ نہیں سکی۔

وہ اس کے لئے ایک بد بخت دن تھا جب اسکی ایک پرانی سہیلی ملنے آئی اور کہا

''تمھیں کچھ احساس ہے؟ تمہارا میاں ٹین ایجر لڑکوں کی سی حرکتیں کر رہا ہے۔تم سوچ سکتی ہو کہ وہ میری بیٹی رنائ سے فلرٹ رہا ہے۔''

مریم کو دھچکا لگا حالانکہ اسے اپنے شوہر کی عادتوں کی علم تھا مگر وہ یہ سب کچھ نہ یقین کر پائی۔رنائ صرف پندرہ سال کی تھی۔

اسنے کچھ کہنے کے لئے منہ ہی کھولا تھا کہ اس کی دوست تڑ سے بولی،

''تم تو بیوقوف ہو مگر تم اس سے کہہ دو کہ میری بیٹی کا پیچھا چھوڑ دے، نہیں تو ہمیں ہی اس صورت حال سے نبٹنا ہوگا۔''

دھڑام سے دروازہ بند کر کے اسکی دوست چلی گئی۔

مریم ساکت بیٹھی رہی، ایک سوال اس کے ہونٹوں پر بھٹکتا رہا۔اس کا گھر ٹوٹنے والا تھا، اسکی زندگی برباد ہونے والی تھی۔اسے کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔

وہ ہیر ڈریسر کے ہاں گئی اور ایک نیا اسٹائل بنوا کر آئی۔جو سب سے خوبصورت لباس اسے نظر آیا وہ خریدا۔پھر وہ اپنی بہن ایمن کے پاس گئی جو میک اپ کرنے کے فن میں ماہر تھی۔اس شام وہ ٹی وی کے سامنے بیٹھی اپنے شوہر کا انتظار کرتی رہی۔اس نے دروازے میں چابی کی آواز سنی تو اپنا انداز کچھ اور سنوارا اور اس کے لئے مسکرائی۔اس نے اسکی طرف دیکھا تک نہیں بلکہ اوپر کی منزل پر سونے چلا گیا۔

وہ اس کے پیچھے گئی، اسکی امید ڈوبتی جا رہی تھی اور دل پر اداسی چھاتی جا رہی تھی۔وہ اسکے سامنے سجی بنی کھڑی تھی اور اسکا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ابراہیم نے اسکی طرف دیکھا اور لاپرواہی سے کہا،

مریم! کیا چاہئے؟''میں بہت تھکا ہوا ہوں اور سونا چاہتا ہوں''۔

''مجھے کچھ نہیں چاہئے'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

وہ اپنی ناکامی کو ساتھ لئے کمرے سے نکل آئی۔گرم آنسو اسکی آنکھوں سے ٹپک رہے تھے۔وہ اپنے کھوئے ہوئے پیار اور کھوئی ہوئی زندگی پر بہت روئی۔اسکے لئے جو بھی بچی کھچی محبت تھی پچھتاوے نے اسے بھی مٹا دیا۔کیوں وہ اس سے شادی پر

راضی ہوگئی تھی؟ کیوں اسنے خود کو مستقل ہارنے دیا؟۔اس نے اسکو اپنی زندگی سے کیوں نہیں نکال دیا؟ وہ اس سے کم تو نہیں تھی۔

صبح کو وہ اپنے ساتھ اداسی اور درد لئے اپنے میکے چلی گئی، کسی نے اس سے نہیں پوچھا کہ وہ کیوں آئی ہے، سب جانتے تھے، وہ تو اس سے بھی پہلے اس کے آنے کے متوقع تھے۔

خود پر جبر کر کے اس نے اپنے بچوں کی یاد پر قابو پانیکی کوشش کی۔اس نے اپنے دل، اپنی محبت اور جذبات کا گلا گھونٹ دیا۔وہ اس کے قابل ہی نہیں تھا۔

روز اس کے بچے فون کرتے اور بتاتے کہ ان کا باپ بہت اداس ہے، وہ اس سے واپس آنے کی التجا کرتے۔وہ نہیں جائیگی، ابراہیم نے اس کی تحقیر کی، اس کو نظر انداز کیا، اس کی بے عزتی کی ہے، اسے ایک لطیفہ بنا دیا جو لوگ اپنے خالی وقت میں ایک دوسرے کو سناتے ہیں۔وہ اسکی طرف سے کسی بات کا حقدار ہی نہیں تھا۔وہ بہت مغرور تھا اسلیئے اس نے مریم کو فون بھی نہیں کیا بلکہ بچوں کی دیکھ بھال کیلیئے اپنی ماں کو لے آیا۔

بہت ہمت کر کے اس نے اپنے گھر والوں سے طلاق کی درخواست دینے کو کہا۔وہ شروع میں ٹال مٹول کرتا رہا آخر کار اپنی رضامندی دے ہی دی۔

جب طلاق کے کاغذات اسے ملے یہ اعلان کرتے ہوئے کہ حقیقت کی چٹان سے ٹکرا کر اس کی محبت کا خاتمہ ہو گیا تو وہ بہت روئی۔نہیں! وہ طلاق مانگنے پر پچھتائی نہیں وہ اپنے بچوں کی یاد میں روئی اور اس لئے روئی کہ اس نے اتنے سال ایک بے ثمر محبت میں گنوا دیئے۔

ایک اور آدمی نے شادی کیلیئے اس کا ہاتھ مانگا۔وہ اس کے پہلے شوہر کی طرح ہینڈسم نہیں تھا اور نہ ہی اتنا کامیاب۔وہ ایک ٹیچر تھا، اسکی بھی ایک شادی ناکام ہوئی تھی اور اس کی ایک چھ سالہ بیٹی تھی۔وہ نرم مزاج اور کھلے دماغ کا مالک تھا۔کیونکہ وہ بھی اپنی پچھلی شادی میں پریشان ہوا تھا اسلیئے وہ ایک مثالی شادی شدہ

زندگی چاہتا تھا اور اسکی قدر بھی کرتا تھا۔

مریم کو وہ اپنی مرضی کے مطابق لگا، بہت سچا اور پرُ خلوص۔ دونوں کے شوق اور مشغلے مشترک تھے۔ آخر اسے وہ مل ہی گیا جس کی اسے تلاش تھی۔ وہ اس سے شادی پر راضی ہوگئی، اسے پورا یقین تھا کہ وہ اس کے ساتھ خوش رہے گی، وہ دونوں ناکام نہیں ہونگے۔

ابراہیم نے جب اسکی منگنی کے بارے میں تو سنا تو اس کی انا کو زبردست ٹھیس لگی۔ وہ تینوں بچوں کے ساتھ اس کے پاس دوڑا آیا۔ وہ اپنے بچوں سے لپٹ کر تھوڑا روئی مگر ابراہیم سے سردمہری سے ملی۔ ابراہیم نے اس سے درخواست کی،

''مریم کیا تم واپس نہیں آؤ گی؟ مجھے اور بچوں کو تمہاری ضرورت ہے''۔

مریم نے بہت سکون اور مضبوطی سے کہا،

''سوری، میں واپس نہیں آؤں گی، اب میری زندگی میں ایک اور مرد ہے''۔

☆☆☆

کاش وہ صرف جذبہ رحم ہی ہوتا

لمیاء باعشنِ

وہ رات بھی باقی اور راتوں کی طرح تھی ۔ میں مچھر دانی برابر کر کے ان کے قریب لیٹ گئی ۔ میں نے اندھیرے میں ان کے چہرے کے نقوش دیکھنے کی کوشش کی ۔ وہ خاموشی سے سو رہے تھے، سانس لیتے ہوئے ان کے سینہ کے زیر و بم کو دیکھتی رہی ۔ ان کے لئے میرے دل میں پیار اُمڈ آیا ۔ ان کا ہر سانس میرے لئے ان کی محبت کا پیغام تھا ۔

میں سوچ رہی تھی "میں جانتی تھی کہ وہ مجھ سے کتنی محبت کرتے ہیں، ان کے دل میں میرے لئے کیا جگہ ہے ۔ تو پھر کیوں میں ان کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دے سکتی؟ میرا بے مہر دل شاید اس کے لئے مورِدِالزام ہے؟ مجھے ان سے کوئی شکوہ بھی نہیں ۔ کتنی ہی عورتیں ہوں گی جو ان جیسے ذہین آدمی سے شادی کرنے کی خواہاں ہوں گی ۔ اوروں کی طرح میں بھی ان کو بحیثیت ایک قابل اسکول ٹیچر پسند کرتی ہوں ۔ ان کی شکل وصورت؟ تیس سال کے متناسب جسم والے وجیہہ مرد ہیں ۔ تو پھر کس چیز کی کمی ہے کہ میں بے چارے اپنے شوہر کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دے پاتی؟ عجیب بات ہے کہ میرے اس رویہ سے انکو جو دکھ ہے اسکی پرچھائیاں سوتے میں ان کے چہرے سے جھلک رہی ہیں ۔ میں بظاہر محبت اور نرمی کا برتاؤ کرنے کی پوری کوشش کرتی ہوں مگر ان کا آئینے جیسا شفاف دل یقیناً بناوٹی محبت اور فطری محبت کا فرق جانتا تھا ۔ میرا دل چاہا کہ میں ان کی پیشانی چوم کر دل کی گہرائیوں سے شب بخیر کہوں اور ہم دونوں کے لئے ایک خوش آئند کل کی دعا مانگوں ۔

اچانک ان کی دلدوز چیخ سے میری آنکھ کھلی۔ پتہ نہیں میں چند منٹ سوئی تھی یا کئی گھنٹے۔ انھوں نے کس کر میرا بازو پکڑ لیا وہ تڑپتے ہوئے بے بسی سے کہے جا رہے تھے۔ ''ارے مجھے بچاؤ، مجھے بچاؤ''۔ میں نے ان کو تسلی دینے کی کوشش کی مگر جب ان کی تکلیف بڑھتی گئی تو میں نے انکے رشتہ داروں کو مدد کے لئے بلا لیا۔

وہ رات میں کبھی نہیں بھول سکتی جب میرے شوہر کیساتھ رات بھر بیڈ روم میں ڈاکٹر موجود تھا اور باہر میں ان کے رشتہ داروں کے ساتھ لرزتی کانپتی کھڑی تھی۔ پوری رات گذر گئی اور صبح ان کو اسپتال لے جایا گیا۔ جہاں سے وہ ایک مہینے کے علاج کے بعد گھر واپس آئے تو صرف آدھے آدمی تھے۔ فالج نے میرے بے چارے شوہر کا ایک حصہ بالکل شل کر دیا تھا۔ میں انکی آنکھوں میں اس حادثہ کا سارا دکھ سمٹا ہوا دیکھ رہی تھی جس نے میرے دل میں ان کے لئے ہمدردی جگا دی تھی۔ وہ بھی میرے آنسو دیکھ کر شدید کرب میں رہتے تھے۔ یہ ہمدردی انھیں قابل قبول نہیں تھی کیونکہ یہ ان کی مردانگی، صلاحیتوں، ذہانت اور من موہنی شخصیت کی سرپرستانہ انداز میں دستگیری کرتی تھی۔ وہ میرا جذبۂ ترحم نہیں چاہتے تھے۔

مگر بس یہ رحم کا ہی جذبہ تھا جس کی چھاؤں میں ہم جب سے جی رہے تھے۔ ان کا غمگین سایہ خاموشی سے چھوٹے سے گھر میں گھومتا رہتا تھا اور میں اپنی نوجوانی کو ساتھ لیئے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں انکے پیچھے اپنی قسمت کے کھیل پر غور کرتی گھومتی رہتی تھی۔ میز پر انکی کتابوں کے انبار تھے ہیں جو وہ اب نہیں کھولتے تھے، قلم اور برش جو وہ اب نہیں چھوتے تھے، موسیقی کے ریکارڈ جو وہ اب نہیں سنتے تھے۔ میری گود میں ان کی دو سالہ بچی تھی جس کو وہ ہاتھوں میں لے کر نہیں جھلا سکتے تھے۔ ان کی پلکوں پر ایک چمکتا ہوا آنسو اٹکا رہتا جسے وہ روکنے کی پوری کوشش کرتے تھے۔ اور میں.....بس میرے دل میں ایک رحم کا جذبہ۔

ایک صبح میرے شوہر اپنی عصا کے سہارے گھر سے نکل کر اپنے اسکول چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں اپنے چھوٹے سے گھر کو تکتی رہی جس میں میرے ابا

نے شادی کے وقت سب ساز وسامان سے سجادیا تھا۔ اسکے بعد سے اس میں کسی چیز کا بھی اضافہ نہیں ہوا۔ الماری میں وہی کپڑے ہیں جو میرے گھر والوں نے دئے تھے۔ میں ایک نیا اسکارف تک نہیں خرید پائی۔ دروازے پر دستک ہوئی اور میرے شوہر کے گھر والوں کا ملازم لڑکا ہاتھ میں کھانے کا طشت لے کر آیا۔ انھوں نے وہ کھانے بھیجے تھے جو میں اپنے شوہر کی قلیل آمدنی سے مہیا نہیں کرسکتی تھی۔ کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ شاید ان کے تئیں میری سردمہری کی وجہ یہ ہے کہ وہ مجھے قیمتی ریشم میں ملبوس نہ کرسکے، میرے گلے میں موتیوں کا ہار نہیں پہنا سکے، میری میز پر نفیس قسم کے کھانے نہیں سجا سکے... یا شاید میں اس لئے ان سے محبت نہیں کرسکی کیونکہ اپنے رشتہ داروں اور بہنوں کا مقابلہ کرنے کے لئے میں کبھی کسی نئے فرنیچر یا نئے لباس کی نمائش نہیں کرسکی۔

مگر وہ کس قسم کی محبت ہے جو صرف مادی چیزوں کی پابند ہو؟ میں ان چیزوں کو کیسے نظر انداز کرسکتی ہوں جو انھوں نے مجھے دی ہیں۔ میں اس علم کو کیسے نظر انداز کرسکتی ہوں جو ان سے گفتگو کے دوران میں نے حاصل کیا؟ کیا انھوں نے مجھے یہ نہیں سکھایا کہ میرے ہاتھ گھر کا کام کاج کرنے کے علاوہ بھی بہت کچھ کرسکتے ہیں۔ میں کیسے بھول سکتی ہوں کہ انھوں نے مجھے گھنٹوں صرف کرکے حروف سے آشنا کرایا، لکھنا پڑھنا سکھایا۔ حالانکہ میں انکی عالمانہ تحریروں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ میں اس سے کیسے انکار کرسکتی ہوں کہ انھوں نے مجھے شعروادب کے رموز سے روشناس کرایا؟ وہ گانے جو میں نے بچپن میں طوطے کی طرح رٹ لئے تھے ان کے نئے معنی میں نے ان سے ہی سیکھے۔ بہت محبت اور دل جمعی سے انھوں نے مجھ جیسی کم فہم کو عبدالوہاب کے گائے ہوئے اور تصنیف کردہ مشہور نغمے جیسے الکرناک، قلوپترا اور الجندول سنوائے اور ان کے مفہوم سمجھائے۔

ہر دل دھڑکتا ہے، ہر زبان پر یہ ہی بات ہے
تم زندگی کا طلسم ہو

تم زمانے میں سب سے جدا ہو
میری محبوب، یہ رات محبت کی رات ہے
کیا تم آؤ گی اور میرے دل کے جشن میں شریک ہوگی؟

دروازے پر دستک ہوئی اور میری سوچوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ میری خالہ آئیں تھیں۔ سلام دعا کے بعد ہم دونوں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ میری بچی میری گود میں سو رہی تھی۔ وہ میرے شوہر کی خیریت اس طرح پوچھنے لگیں جیسے مجھ پر رحم کھا رہی ہوں۔ وہ میری بدبختی پر افسوس کرتی رہیں۔ پھر اچانک انھوں نے ایک عجیب سا مشورہ دیا۔ ان کا خیال تھا کہ میرے لئے بہتر ہوگا کہ میں اب یہ گھر چھوڑ دوں۔ ان کی اس قسم کی ہمدردی سے میں حیران ہوگئی۔ وہ سنگ دلی سے کہے جا رہی تھیں،

''اب یہ آدمی کسی کام کا نہیں رہا، بالکل آدھا آدمی رہ گیا ہے۔''

میرا دل چاہ رہا تھا کہ ان کا منہ بند کردوں مگر ان کی زبان زہر اگلتی رہی کہ فالج چھوت کی بیماری ہے اور اگر میں زیادہ دن ان کے ساتھ رہی تو مجھے بھی یہ بیماری ہو سکتی ہے۔ آخر مجھے ان کو خاموش کرانا ہی پڑا۔ میں نے ان سے کہا کہ اس وقت جب میرے شوہر کو میری ضرورت ہے میں ان کو چھوڑنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ مگر وہ میرے اس اٹل ارادے کو کمزور کرنے کے لئے میرے قریب کھسک کر سرگوشی میں بولیں کہ وعدہ کرو کہ تم اسے خود کو چھونے نہیں دو گی کیونکہ فالج موروثی بیماری بھی ہوتی ہے۔ سراسیمگی میں میرے آنسو ہی ان کے عجیب سے سوال کا جواب تھے۔ اس خوش فہمی میں کہ میں نے ان کا کہنا مان لیا ہے انھوں نے آخر کار میرا پیچھا چھوڑا اور رخصت ہوئیں۔

اس شام میں اپنے شوہر کے آنے کا بے تابی سے انتظار کر رہی تھی اس امید کے ساتھ کہ ہم دونوں اپنی زندگی کو مل کر جنت بنائیں گے، اس محبت کے ساتھ جس کو وہ صرف رحم سمجھتے تھے۔ لکڑی کے زینے پر ان کے قدموں کی آواز اور عصا کی کھٹ کھٹ سنائی دی۔ وہ بہت آہستہ آہستہ احتیاط سے چڑھ رہے تھے۔ میں دوڑ کر

دروازے تک ان کے استقبال کے لئے پہنچی اور اپنا ہاتھ بڑھایا جو انھوں نے ذرا ہچکچاتے ہوئے تھام لیا۔ میں ان کو انکے پڑھنے کے کمرے میں لے گئی، ان کتابوں کے اوراق کھولے جو انھوں نے مدت سے نہیں کھولی تھیں، ان کے سوکھے قلم کو روشنائی میں ڈبویا۔ میں ان کے دلکش ہاتھ کو دیکھتی رہی اور وہ خوش خطی سے حسین انداز میں لکھتے رہے۔ بالکل الکرناک کی موسیقی کی طرح حسین جو کمرے میں تیر رہی تھی۔ انھوں نے میرے چہرے کی طرف متلاشی نگاہوں سے دیکھا کہ اس وقت اس پر محبت تھی یا رحم؟

نو مہینے بعد ایک چاند سے چہرے نے ہماری طرف دیکھا۔ ہمارا بیٹا غالی، میرے دل میں چھپی محبت کی نشانی، ہو بہو اپنے نرم خو اور روشن خیال باپ کی تصویر۔ کیا میرے شوہر کو میری محبت کا اس سے بھی زیادہ کوئی اور ثبوت چاہئے؟ باپ کی اتنی زیادہ شباہت کی اس کے علاوہ اور کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ یہ بچہ میرے دل کے اندر پروان چڑھا تھا۔ یہ بچہ اپنے باپ کی طرح ذہین تھا جس بچے کے لئے میری خالہ کا کہنا تھا کہ باپ جیسی معذوری لے کر پیدا ہوگا۔

قسم خدا کی، اپنے بیٹے کی پیدائش سے پہلے میں کبھی اتنی خوش نہیں رہی۔ ہم ایک روحانی خوشی میں سرشار تھے اور یوں ہی سال گذرتے گئے۔ وہ چمکتے چہرے اور جگمگاتے دل کے ساتھ اپنے شب و روز گذارتے رہے۔ میں روز صبح ان کو مسکراہٹ کے ساتھ رخصت کرتی اور مسکراہٹ کے ساتھ استقبال کرتی۔ غالی اور اسکی بہن لؤلؤ اپنی عمر کی منزلیں طے کرتے ہماری زندگی میں خوشی کے رنگ بکھیرتے رہے۔

اور پھر وہ رات آئی جو کسی اور رات ہی کی طرح تھی، میں مچھر دانی گرا کر ان کے پاس لیٹ گئی۔ میں نے اندھیرے میں ان کے چہرے کی طرف دیکھا، وہ جاگ رہے تھے اور میری طرف محبت سے دیکھ رہے تھے، کبھی نہ ختم ہونے والی محبت۔ انھوں نے دھیرے سے کہا،

''شکراً''۔ میں مسکرائی اور ان کے شانے پر سر ٹکا کر نیند کی آغوش میں چلی

گئی۔ رات کے سناٹے میں ایک بار پھران کی چیخ ابھری، میں گھبرا کر اٹھی تو وہ کس کر
میرا بازو پکڑے ہوئے تھے اور مدد کے لئے چلا رہے تھے۔ میں نے ان کا سر اپنے
سینے سے لگا لیا، ان کو تسلی دینے کی ناکام کوشش کی۔ جب تکلیف بڑھتی گئی تو میں نے
گھر کے ملازم لڑکے کو بھیج کر ان کے گھر والوں کو بلوایا۔ گھپ اندھیرے میں وہ لوگ
ان کو اسپتال لے گئے۔ چند دن بعد ان کا جسدِ خاکی واپس لایا گیا۔

میرے شوہر، ابو غالی چلے گئے۔ میری عمر بیس سال سے کچھ ہی زیادہ ہے
اور وہ دل کو ایک گہرا زخم دے کر مجھے بیوہ بنا کر چلے گئے۔

کاش میں نے ان سے محبت کی ہی نہ ہوتی۔ کاش صرف ہمدردی اور رحم کا
جذبہ ہی کارفرما رہتا۔ کاش کہ میں کٹھور دل اور سرد مہر ہی رہتی تو دل اس طرح تو نہ ٹوٹتا۔

میں اپنے اس گھر سے چلی آئی، اپنی عظیم محبت کے مسکن کو چھوڑ دیا۔ وہ سارا
فرنیچر اور کپڑے جو شادی پر مجھے جہیز میں ملے تھے سب ویسے ہی چھوڑ دئے، کہہ
دیا کہ انھیں جو بھی قیمت لگے بیچ دیا جائے۔ میں اپنے میکے لوٹ آئی، اپنے دو بچوں
کے ساتھ جن کے نام کے ساتھ ان کا نام منسلک تھا۔ اپنے ساتھ اس گھر سے صرف
ان کے ہاتھ کی حسین تحریریں لے آئی جن میں ان کے ہاتھوں کا لمس تھا، وہ کتابیں
لے آئی جو کبھی ان کی نظروں سے آشنا تھیں اور وہ ریکارڈ لے آئی جو ہم مل کر سنتے تھے
اور گنگناتے تھے۔

میری محبوب، یہ رات محبت کی رات ہے
کیا تم آؤ گی اور میرے دل کے جشن میں شریک ہو گی؟

☆☆☆

خزاں کی راتیں

سمیرہ خاشقجی

دروازہ بند کر کے جب گھر سے نکلی تو بارحہ نے چین کا سانس لیا۔ ہر جمعہ کو اس کو شوہر کی طرف سے اجازت ہے کہ وہ جا کر دن بھر کلب میں تفریح اور آرام کرے۔ اس دن وہ اپنی دوستوں کے ساتھ مزے سے کچھ گھنٹے اس عورت کی طرح گذارتی ہے جسے گھر کے کام سے کوئی مطلب نہ ہو، بچوں کی دیکھ بھال نہ کرنی ہو، شوہر کے مسائل نہ سننے ہوں۔ کیسی اکتا دینے والی اور بورنگ زندگی تھی، کیسی اکتا دینے والی باتیں اس کے شوہر کی ہوتی تھیں۔ ان سب سے اسے کچھ دیر چھٹکارا مل جائے اسی لئے اس کے شوہر سلیم نے اسے ایک دن بالکل بے فکر اور آزاد رہنے کی اجازت دے دی تھی۔ اس روز وہ دوپہر کے کھانے کے لئے بھی گھر نہیں آتا تھا، باہر ہی دوستوں کے ساتھ کھالیتا تھا۔

سلیم کو کیا ہوگیا؟ وہ تو بہت دلچسپ اور خوش مزاج ہوا کرتا تھا۔ وہ اتنا بورنگ اور اتنا چڑچڑا کب سے ہوگیا؟ ایسا لگتا تھا کہ وہ خود بھی کافی بدل گئی ہے۔ وہ الجھی الجھی، بے دلی سے مشین کی طرح گھر کے کام نمٹاتی تھی۔ شام کو جب اپنے شوہر کے ساتھ ٹی وی دیکھنے بیٹھتی تو تھکی ہوئی ہوتی تھی اور کبھی کبھی وہیں سو جاتی تھی۔ جب سلیم مذاق میں کہتا ''ہماری بیوی کو سونے کی بیماری ہوگئی ہے، بیٹھے بیٹھے بھی سو سکتی ہے'' تو وہ چونک کر جاگ جاتی۔ بارحہ سلیم کی باتوں کی آواز سے جاگ تو جاتی تھی مگر کبھی کبھی اسکی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ جاگ رہی ہے یا سو رہی ہے۔ پھر وہ بستر پر جا کر سو جاتی۔

اسی طرح دن گذرتے گئے۔ کیا اسی طرح کی زندگی اس نے چاہی تھی؟

ایک دن جب کلب میں وہ اپنی دوست حیام کا انتظار کر رہی تھی تو براحہ ان دنوں کی یاد میں کھوگئی جب وہ سولہ سال کی تھی اور اس کے خوابوں کا پچیس سالہ شہزادہ، مضبوط جسم والا اور قد آور تھا۔ سورج نے تپا کر اس کا جسم تانبے کی طرح بنا دیا تھا۔ اس کی نگاہیں تیز تھی، ہونٹ خمدار تھے۔

وہ اس سے ایک پارٹی میں ملی تھی، اسکے چچا نے اس کا تعارف کرایا تھا، ''یہ امیر زاہد ہیں، اور یہ میری بھتیجی براحہ ہے۔'' وہ حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ اس نے پہلی بار کسی اصلی شہزادے کو دیکھا تھا۔ اسنے ایک شرمیلی مسکراہٹ سے پوچھا تھا۔

''کیا آپ واقعی ایک شہزادے ہیں؟''

شہزادہ زاہد نے مسکراتے ہوئے کہا تھا ''ہاں، مگر مجھے خطاب اور القاب کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔''

اس نے شوخی سے مسکرا کر کہا تھا ''تب تو آپ خوابوں کے شہزادے ہوئے۔''

دوسرے دن اسکے چچا نے زاہد کو اپنے گھر مدعو کیا اور براحہ کو بھی ڈنر پر بلالیا۔

وہ بیوٹی پارلر گئی اور وہاں سے ایک گھنٹے کے بعد فخر اور پورے اعتماد سے باہر آئی۔ اسے احساس تھا کہ وہ اپنے نئے لباس اور ہیر اسٹائل میں بے حد حسین لگ رہی ہے، وہ کسی شہزادی کی طرح لگ رہی تھی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ وہ شرما رہی تھی، جھجک رہی تھی، حیران تھی۔

چچا کے گھر گئی، امیر زاہد سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اپنے دونوں ہاتھوں میں اسکا ہاتھ لے کر کہا ''تم سے مل کر بہت اچھا لگا۔''

پھر انھوں نے اسے سر سے پاؤں تک بغور دیکھا۔ وہ سمجھ گئی کہ وہ اسکی طرف مائل ہیں۔ وہ خوشی سے شرابور ہوگئی جب انھوں نے کہا،

''تم بہت حسین اور نازک ہو، ایک بچی کی طرح شرماتی ہو۔''

براحہ نے جھجکتے ہوئے کہا'' آپکی ذرہ نوازی ہے۔''

اس نے اپنی کتھئی آنکھوں سے امیر زاہد کیطرف دیکھا تو انکی نظروں میں ایک دلنشیں چمک پائی۔ انھوں نے اشتیاق سے پوچھا'' تم نے اسکول کی پڑھائی ختم کرلی؟''

'' مجھے ابھی ہائی اسکول کا ڈپلوما ملا ہے اور اگلے سال یونیورسٹی میں داخلہ لوں گی۔''

اسکے چچا خوش تھے۔ انھیں یقین ہو گیا تھا کہ امیر زاہد کو براحہ پسند آگئی ہے اور وہ اس سے شادی کرنا چاہیں گے۔

اور اگلے دن یہی ہوا۔ امیر زاہد نے اسکے چچا کے پاس پیغام بھجوا دیا۔ اسکے خاندان والوں نے جلدی سے رائے مشورہ کیا اور اس کے والد نے شادی کی رضا مندی دے دی۔

براحہ خوشی سے جھوم اٹھی۔ پرنس نے اسے قیمتی تحفے دیئے۔ اخباروں تک میں ان کی محبت کی کہانی اور مستقبل قریب میں ہونے والی شادی کی خبر چھپی۔

اسکے تھوڑے ہی دن بعد چچا آئے اور رسان سے اس سے کہا،

'' براحہ، میں تم سے صاف بات کرنا چاہتا ہوں۔ پرنس زاہد کی پہلے اپنی کزن سے شادی ہو چکی ہے اور ان کے پانچ بچے ہیں۔ مگر اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ ہمارے مذہب میں مرد چار عورتوں سے شادی کر سکتا ہے، وہ اپنی محبت اور دولت سے تم کو خوش رکھے گا۔ تم کو دولت، عزت اور مسرت سب کچھ ملے گی۔''

براحہ خاموشی سے حیران و پریشان کچھ دیر تک اپنے چچا کو دیکھتی رہی۔ پھر وہ چلا اٹھی،

''میں کبھی شادی شدہ مرد سے بیاہ نہیں رچاؤں گی چاہے وہ مجھے دنیا بھر کی دولت ہی کیوں نہ دے دے۔''

یہ کہہ کر وہ پلٹ کر جانے ہی لگی تھی کہ چچا نے اسے پکڑ کر سمجھانے کی کوشش کی

"عقل سے کام لو براحہ، ورنہ پچھتاؤ گی۔ تم کو اس سے بہتر دولہا نہیں ملے گا۔"
اس وقت اسے اپنے چچا سے نفرت آنے لگی تھی۔ ان کی طرف دیکھ کر اس نے بہت دکھ کے ساتھ کہا تھا،
"آپ اور میرے ابا، اور سارے گھر والے اس شخص سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے، آپ کو تو دولت سے غرض ہے۔ میں ایسا آدمی چاہتی ہوں جو میرا ہو کے رہے۔ پرنس کی دولت ہاتھ سے جاتی ہے تو جائے۔ میں کوئی بکنے والی باندی نہیں ہوں۔ میں ایک آزاد عورت ہوں، خوددار اور باعزت۔"
براحہ محبت سے لبریز شادی شدہ زندگی کی خواہاں تھی۔ کسی اور عورت کی خوشیوں کو برباد کر کے وہ کیسے خوش رہ سکتی تھی۔ اس قصے کے بعد وہ الجھی الجھی رہنے لگی۔ رات کو سوتے سوتے وہ کسی ڈراونے خواب سے گھٹی ہوئی سی چیخ کے ساتھ یکلخت جاگ جاتی۔
یونیورسٹی میں اس کی ملاقات سلیم سے ہوئی۔ اس کا مہذب انداز اور مزاج کی نرمی اور اطمینان اسے پسند آیا۔ وہ اب خوش بھی رہنے لگی۔ یونیورسٹی کی پڑھائی کے دوران یہ تعلق بس دوستی تک ہی محدود رہا مگر جب اسکا گریجویشن مکمل ہو گیا تو سلیم اس سے ملا اور بہت دھیرے سے کہا،
"براحہ، میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"
براحہ مسکرائی اور پر سکون لہجے میں اعتراف کیا،
"سلیم تم سے شادی کر کے مجھے خوشی ہو گی۔"
سلیم کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا تھا۔ اس نے براحہ کو گلے سے لگاتے ہوئے، خوشی سے سرشار لہجے میں کہا تھا "میں ابھی تمہارے والد سے تمہارا ہاتھ مانگتا ہوں۔"
اور پھر ان دونوں کی شادی ہو گئی تھی۔

سال تیزی سے گذرتے رہے اور زندگی ایک مخصوص ڈھرے پر چلتی رہی۔

براحہ نے خود سے سوال کرنا شروع کر دیا کہ اسکی زندگی اتنی بورنگ کیوں ہے۔ کیا وہ پرنس سے شادی کر لیتی تو بہتر ہوتا؟ مگر جواب نفی میں آتا۔

اسے کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ ایکدن جب اس کی ملاقات حیام سے ہوئی تو وہ دونوں باتیں کرنے لگیں۔

''کیا ہوا براحہ، مرجھائی مرجھائی سی لگ رہی ہو۔''

''کوئی بات نہیں، میں ٹھیک ہوں۔''

''کیا سلیم سے جھگڑا ہوا ہے؟''

''نہیں۔''

''تو پھر تم بور ہوگئی ہو۔ میں نے تم سے گریجویشن سے پہلے نہیں کہا تھا کہ شادی شدہ زندگی کچھ سال بعد بے لطف ہو جاتی ہے۔''

''ایسی باتیں کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سلیم دل کا بہت اچھا ہے مگر بہت مصروف رہتا ہے۔''

''اور تم؟ تمھیں کیا ہوا ہے؟ تمھیں حق نہیں ہے کہ اس کیساتھ وقت گذارو، اس کے ساتھ ہنسو بولو؟ کھل کر اس سے بات کرو، اپنے دل کی بات اسے بتاؤ۔ اپنے جذبات چھپاتی کیوں ہو؟ بوریت کو اپنے اوپر حاوی مت ہونے دو۔ اپنے گھر کی خوشیوں کو ہاتھ سے مت جانے دو۔ اپنے بچوں سے دور مت ہو۔ کہیں سمندر کے پانی سے کٹ کٹ کرنابود ہو جانے والی چٹان مت بن جانا۔ میری بات کا یقین کرو، اگر وہ تمہارے لئے کچھ جذبات رکھتا ہے تو وہ خود کو بدل لے گا۔''

اتفاق سے اس دن سلیم رات کو دیر سے گھر لوٹا۔ اس نے براحہ کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ براحہ نے رقت بھری آواز میں کہا،

''کتنی بورنگ زندگی ہے۔ تمہارے رویہ کی وجہ سے میں گھر اور بچوں سے بھی بیزار ہوتی جا رہی ہوں۔''

سلیم کو جھٹکا سا لگا مگر اس نے دھیرج سے کہا،

''میری جان! اتنی پریشانی کی تو کوئی بات نہیں ہے۔ میں اتنی محنت کیوں کرتا ہوں؟، کیوں اتنا تھک جاتا ہوں؟ تم نہیں جانتیں؟ یہ سب تمہارے اور بچوں کے لئے ہی تو کرتا ہوں۔''

براحہ مصر رہی ''بس رہنے دو سلیم! اور بھی شوہر ہیں جو اپنے بیوی بچوں کے لئے محنت کرتے ہیں۔ مگر کچھ شوہر یہ بھی جانتے ہیں کہ ان کی بیویوں کو بھی زندگی کا لطف اُٹھانے کا حق ہے۔''

وہ ایک لمحے کے لئے رکی اور پھر بھرائی ہوئی آواز میں کہا،

''اگر تم سمجھتے ہو کہ زندگی صرف کھانا، کپڑا اور پیسے کا نام ہے تو تم غلطی پر ہو۔''

سلیم نے شدت جذبات اور پیار سے اسے لپٹا لیا، دونوں کی نگاہیں ملیں،

''مجھے ایک اور موقع دو کہ تمھیں خوشی دے سکوں، تم میری زندگی ہو، آرزو ہو، حوصلہ ہو۔'' سلیم نے التجا کی۔

براحہ نے اپنا سر اسکے شانے پر رکھدیا۔ اپنا تھکا ہوا سر اس کے سینے سے لگا کر اسے کتنی راحت ملی۔

جب بھی وہ اپنی دوست حیام کو یاد کرتی ہے، اسکی آنکھیں تشکر کے آنسوؤں سے بھر جاتی ہیں۔

☆☆☆

ایک پر والی چڑیا

لمیاء باعشن

میں ایک دم کھڑی ہوئی اور تیر کی طرح وہاں سے چل دی۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں، میرے قدم اس سے دور جانے کے لئے بیتاب تھے۔ اس سے .....اپنی زندگی کی خواب سے، میرا خیال تھا کہ وہ ہی ایک فردِ واحد ہے جو مجھے پوری طرح سمجھتا ہے۔ ''مریم!'' اس نے پیچھے سے آواز دی، ''کیا ہوگیا مریم؟''

میں نے اپنے کان بند کرلئے۔ ہاں! میں نے، جو اس آواز میں اپنا نام سننے کی منتظر رہتی تھی۔

ابھی کچھ منٹ پہلے میں خوشی کے ہنڈولے میں جھول رہی تھی۔ جس لمحے کے لئے جیتی تھی وہ آخر آ ہی گیا تھا۔ وہ میرے پاس بیٹھا تھا، کہہ رہا تھا، ''مریم تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔ اگر تمھیں اعتراض نہ ہوتو میں چچا سے شادی کیلئے تمہارا ہاتھ مانگوں۔''

میرا دل اس کی طرف کھنچا چلا جا رہا تھا، میں نے ہولے سے کہا ''میں اچھی لگتی ہوں؟''

''اور کون، مریم؟ کیا تمھیں پتہ نہیں، ہم دونوں تو بچپن سے ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی ہم نے اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا۔ یہ حیرانی کیسی؟''

''میں تو تمہارے پیار کو صرف اپنا تخئیل ہی سمجھتی تھی''، میں نے دھیمی آواز میں کہا،

''اور خاص کر تمہارے ولایت جانے کے بعد۔ اتنی دور جا کر تمہاری زندگی میں بہت سے نئے مواقع آئے ہونگے۔ میں سوچتی تھی کہ مجھ میں ایسی کون سی بات

ہے جوتم دوسروں کے مقابلے مجھے ہی پسند کرو گے۔''

''بدھو!'' وہ مسکرایا۔ ''تمہاری جیسی خوبصورت لڑکی مجھے اور کہاں ملتی ؟ میں ہمیشہ سے تمہاری نیلی آنکھوں، سنہرے بالوں اور پیاری سی گوری رنگت کا دیوانہ ہوں........''

اور پھر یہ ہوا کہ اچانک اس کے الفاظ میرے کانوں میں بجلی کی طرح کڑکے، میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ میں دیوانہ وار وہاں سے بھاگی۔ میرے کانوں میں ایک آواز گونج رہی تھی۔ ''ہم میں سے وہ کس کو چاہتا ہے، میری (Mary) کو یا مریم کو؟ مجھے یا میری کو؟'' چاروں طرف غصے کا ایک طوفان تھا جو مجھے اس سے، اس باغیچے سے، اس دنیا سے سے اڑا ئے لئے جار ہا تھا۔

اس کی آواز مجھے زہر لگ رہی تھی، میرا پیچھا کر رہی تھی۔ ''مریم، ایک منٹ رکو! ہو کیا گیا؟'' میں کچھ نہیں کہنا سننا چاہتی تھی۔

میرے بھاگتے ہوئے قدم، سڑھیاں پھلانگ کر گھر کے صدر دروازے تک پہنچ گئے۔ وہ ہی دروازہ جہاں کبھی میں ایک خوفزدہ سات سالہ بچی کے روپ میں کھڑی تھی، دروازہ کھلنے کی منتظر تھی۔

''اندر آ جاؤ مریم'' مجھ سے کہا گیا تھا۔ دو اجنبی، ایک مرد اور ایک عورت باہیں پھیلائے مجھے خوش آمدید کہنے کے لئے کھڑے تھے۔ ''اب یہ تمہارا خاندان ہے۔ تم ان کے ساتھ خوش رہو گی۔''

بادلِ ناخواستہ، میں بھاری قدموں سے اس بڑے سے گھر میں داخل ہوئی تھی، مڑ مڑ کی دیکھتی رہی یہاں تک کہ دروازے پر کھڑی ہوئی دادی کا چہرہ چھوٹا ہوتا گیا اور آخر میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

''ہم میں سے وہ کس کو چاہتا ہے، مجھے یا ''میری'' کو؟'' میں بڑے سے ہال میں بے تحاشہ وہ دوڑی جا رہی تھی، آنسوؤں کی دھندلاہٹ میں یادوں کے اور کتنے سائے نظر آ رہے تھے۔ اسی کمرے میں گھر کے سب لوگ موجود تھے، احمد، ایمان

اور میں کھیل رہے تھے۔ایمان نے ماما سے پوچھا تھا،

''مریم کے بال سنہری کیوں ہیں؟''

میری نگاہیں ان کے چہرے پر رک گئی تھیں، انھوں نے جب دھیرے سے کہا''اللہ کی مرضی۔''تو میں نے چین کا سانس لیا تھا۔

مگر پھر احمد نے کہا تھا،

''اگر مریم واقعی ہماری بہن ہے تو ضرور جب یہ پیدا ہونے والی ہوگی تو ماما نے باربی ڈولBarbie Doll کی دعا کی ہوگی۔'' میں نے ماما کے چہرے کی طرف متوقع نظروں سے دیکھا کہ وہ کوئی مناسب سا جواب دیں گی مگر انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مجھے پھر سے گھٹن ہونے لگی۔

ایمان نے پھر ماں کی خاموشی کو کریدا تھا،

''یہ سچ ہے ماما؟ جب یہ ہونے والی تھی تو کیا آپ نے باربی ڈول کیلئے دعا مانگی تھی؟''

''یہ کیا حماقت کی باتیں ہیں''وہ ایکدم بولیں''میں نے کہا نا کہ یہ صرف اللہ کی مرضی ہے۔''وہ نروس سی لگ رہی تھیں۔

''تو پھر مریم ہم جیسی کیوں نہیں ہے، وہ باربی ڈول جیسی کیوں لگتی ہے۔'' احمد نے پھر سوال داغا تھا۔

ہاں میں بھی یہ ہی سوچ رہی تھی۔مگر ماما کے پاس اسکا کوئی جواب نہیں تھا۔نہ جانے وہ کیوں غصہ ہوگئی تھیں اور ہمیں کمرے سے چلے جانے کو کہا تھا۔ اور اسی دن ہمارے کھلونوں کے ڈبے سے باربی ڈول غائب ہوگئی۔اسی قسم کی باتیں بار بار ہوتی رہیں، اسکول میں بھی اور ملنے جلنے والوں میں بھی۔ ہمیشہ ایک عجب سی اداسی اور ان سوالوں پر بات ختم ہو جاتی تھی جن کا کوئی جواب نہیں ملتا تھا۔خاندان میں اس موضوع پر بات کرنا منع تھا۔ میں سب سے مختلف کیوں تھی۔میری شکل کسی اور سے کیوں نہیں ملتی سوائے اس کمبخت باربی کے؟''

جب میں دس سال کی ہوئی تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ایک بار جب دادی ملنے

آئیں تو میں نے باغیچے میں لے جا کر ان سے پوچھا،

''مجھے بتایئے دادی کہ مجھے آپ کہاں سے لائی تھیں؟''

انھوں نے اپنی ناک پر ٹکی عینک کے اوپر سے مجھے بغور دیکھا اور ہکلاتے ہوئے کہا تھا،

''یہ کیا عجیب سی بات تم نے پوچھی مریم۔''

''مگر میں نے آج ماما کو فون پر بات کرتے سنا تھا۔ وہ کہہ رہی تھیں 'اسکی شکل دیکھ کر مجھے سخت تکلیف ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ ہمیشہ مجھے اس دوسری عورت کی یاد دلا دیتی ہے۔'''

''مگر تم یہ کیوں سمجھتی ہو کہ وہ تمہارے بارے میں بات کر رہی تھیں؟''

''پلیز دادی! یہ پہلی بار نہیں ہے۔'' میں نے پہلے بھی اپنے بارے میں کسی اہم راز کے ٹکڑے اکٹھا کئے ہیں........کبھی کسی کی زبان سے غلطی سے پھسلے ہوئے کچھ جملوں سے، کبھی خود چھپ چھپ کر سنی باتوں سے، کبھی کچھ دیکھ کر۔

''کیا میری کوئی اور ماں ہے؟'' احمد اور ایمان کی اماں کے علاوہ؟''

اس دن دادی کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔ انھوں نے آہستہ آہستہ مجھے ساری بات سچ سچ بتا دی....تباہ کن سچ۔ بے چاری دادی نے بہت رسان سے مجھے سب کچھ بتایا تھا مگر پھر اس بات پر کہ انھوں نے مجھ سے سب کچھ اب تک کیوں چھپائے رکھا، انھیں کو میرے بے تحاشہ غصے کا بھی سامنا کرنا پڑا تھا۔ جب میں نے چیخنا اور رونا شروع کر دیا تو انھوں نے ہی اپنی بانہوں میں لے کر مجھے تسلی دی تھی۔

اس کے بعد میں خود میں سمٹ سی گئی۔ مجھے لگتا تھا کہ کہ صرف میرا کزن ہی میری تنہا زندگی میں داخل ہو سکتا ہے۔ اسکی آنکھیں میری ذات کے اندر جھانک سکتی ہیں۔ اسکے کان میرے گھٹی ہوئی چیخیں سن سکتے ہیں۔ کیا یہ احساس بالکل غلط تھا؟ میرے اتنے انتظار کے بعد اس نے میرے بجائے ''میری'' کو منتخب کیا۔

اپنے کمرے تک جاتے ہوئے میری نظر ایمان پر پڑی۔ وہ ہمیشہ کی طرح فون سے چپکی ہوئی تھی۔

ہاں ٹیلی فون....... یہ آئیڈیا مجھے پہلے بھی آیا تھا....''ہیلو، ہیلو Seattle Washington میں..........سے بات کرنا چاہتی ہوں....''
مگر مجھے تو ان کا نام اور پتہ بھی نہیں معلوم تھا۔
میں نے دادی سے ایک بار پوچھا تھا۔'' دادی کیا میں ان سے فون پر بات کر سکتی ہوں؟''
''نہیں!'' انھوں نے گندھا ہوا میدہ زور سے تسلے میں پٹختے ہوا کہا تھا۔ جیسے میرے منہ پر ایک چانٹا مار رہی ہوں۔
''کیا میں خط لکھ سکتی ہوں؟'' میں نے معلوم کرنے کی کوشش کی تھی۔
''نہیں!'' انھوں نے حتمی طور پر کہا تھا۔'' مریم! میں تو پچھتا رہی ہوں کہ ناحق تمھیں سب کچھ بتا دیا۔ اس دن ہم دونوں نے وعدہ کیا تھا کہ یہ موضوع پھر کبھی دوبارہ نہیں چھیڑا جائے گا۔''
میرے والد کے سخت احکام تھے کہ اپنی ماں کے متعلق مجھے کچھ نہ معلوم ہو۔ تو میں ان کے بارے میں جانے بغیر ہی بڑی ہوئی، ایک یتیم کی طرح۔ جب میں بہت چھوٹی تھی تو کچھ عرصے تک سمجھتی رہی کہ دادی ہی میری ماں ہیں کیونکہ میں ان ہی کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ ہی مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گئیں تھیں۔ ڈاکٹر نے بتایا تھا'' اسکے ہکلانے کی وجہ یہ ہے کہ اسے اتنی چھوٹی سی عمر میں اپنے پہلے گھر سے جدا ہونا پڑا۔''
اسکے بعد دادی نے مجھے اتنی محبت دی کہ میرا ہکلانا بند ہو گیا تھا۔
جب میں سات سال کی ہوئی میں نے اپنی دادی کو کہتے ہوئے سنا'' آنکھ اوٹ پہاڑ اوٹ! اگر یہ کچھ اور عرصے میرے ساتھ رہی تو میرا بیٹا اسے بالکل ہی بھول جائے گا کہ یہ اسکی بیٹی ہے، اس کے خاندان کی ایک فرد۔ باپ کی نگہداشت میں ہی اسے پلنا چاہئے۔'' اور پھر دادی مجھے ماما، بابا، احمد اور ایمان کے پاس رہنے کے لئے لے گئی تھیں۔
جب مجھے معلوم ہو گیا کہ میری ایک ماں ہے.....خواجہ.....مغربی ملک کی باشندہ (سعودی عرب میں رہنے والے یورپین اور امریکنوں کو خواجہ کہتے ہیں) تو میں نے یہ ظاہر

کیا کہ جیسے مجھے اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ مگر میرے اندر سے ہزاروں آوازیں مجھے اکساتی تھیں کہ میں انھیں تلاش کروں۔ انھوں نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟ یا جب میں چار سال کی تھی تو ہم دونوں کیوں بچھڑ گئے؟ مجھے وہ یاد کیوں نہیں ہیں؟ مگر لاشعور بھی بہت طاقت ور ہوتا ہے۔ دادی نے جب سے ان کے بارے میں بتایا تھا تو ایک شفیق سی گوری اور سنہرے بالوں والی عورت کی یاد میرے دل میں جاگ اٹھی تھی۔ حالانکہ دوسروں کے سامنے میں اس بارے میں بالکل لاتعلقی کا اظہار کرتی تھی۔ مگر ہر رات سونے سے پہلے میری گھٹی ہوئی سسکیاں میری یادداشت میں چھپی ہوئی اس عورت کو ڈھونڈتیں جس کی ہلکی نیلی آنکھیں تھیں اور چمکیلے سنہرے بال تھے جس میں وہ سیدھی طرف مانگ نکالتی تھی۔ وہ خوبصورت گول چہرے والی عورت اب کبھی مجھے نہیں دیکھ پائے گی۔ وہ عورت جس نے مجھے جنم دیا اور پھر ہمیشہ کے لئے کہیں چلی گئی، جانے کہاں غائب ہوگئی۔ محافظوں کی نظر سے دور میں اور میری ماں ہر رات سرگوشیوں میں باتیں کرتے تھے۔ وہ مجھے "میری" کہہ کر بلاتی تھی۔

روتے ہوئے بھاگنے سے میری سانس پھول گئی اور بہت سے سوالات ہتھوڑے کی طرح ذہن پر برسنے لگے۔ جب کبھی میں اجنبیوں کی متجسس نگاہوں سے بچ کر کسی گوشہ میں جا چھپتی تھی یہ ہی سوالات مجھے گھیرے رہتے تھے۔ "میں کون ہوں؟ میں آدھی یہاں ہوں، باقی کہاں ہوں؟ میری ماں کس قسم کی عورت تھیں؟ کیا انھیں میرے بابا سے محبت تھی؟ مجھ سے محبت تھی؟ میرے بابا ان کو کیسے بھول گئے اور مجھے بھی انھیں بھول جانے کی تاکید کی گئی۔ بابا ان سے کیوں اتنی نفرت کرتے ہیں کہ اپنی اور میری زندگی سے انھیں یکسر باہر نکال دیا؟ اپنے مستقبل کے نقشے بنانے کے لئے مجھے ماضی سے جدا ہونا پڑے گا لیکن پہلے مجھے اپنا کھویا ہوا ماضی ملے تو سہی۔ نہیں تو میں یوں ہی آسمان میں کٹی پتنگ کی طرح ڈولتی رہوں گی۔

اُن کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوتھا اور وہ اپنے بال بنا رہی تھیں۔ وہ عورت جو میرے بابا اور میری زندگی میں دخیل ہیں۔ ہماری دشمن؟ بے شک۔ کیا انھوں نے میرے بابا کے دل میں میری ماں کی جگہ نہیں ہتھیا لی؟ انھوں نے ضرور ایسا کچھ کیا ہوگا کہ جس سے میرے بابا نے میری ماں سے ترک تعلق کرلیا۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ ان کا

رویہ میرے ساتھ ہمیشہ اچھا رہا۔ مجھے ان سے چڑ بھی نہیں تھی۔ مگر ''میری'' ان کو ہمیشہ شک کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ ''میری'' کبھی کبھی بھڑک جاتی تھی اور کھلم کھلا ان کی نافرمانی کرتی تھی، اس کے اس رویہ سے ''میں'' شرمندہ ہو جاتی تھی۔

میرا اور ''میری'' کا جھگڑا بڑھتا گیا اور یہاں تک کہ اس نے مجھے دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔

آخر کیوں ''میری'' نے میرے کزن کی محبت جیت لی؟ میں کیسے ہار گئی؟

''تم سب سے الگ طرح کی دلہن ہوگی'' وہ بیوقوف کہہ رہا تھا۔ ''تم سے تو کوئی بھی مرد شادی کرنے کا خواب دیکھ سکتا ہے۔ اور کہاں اس طرح کا نرالا امتزاج کسی کو ملے گا؟ ایک عرب کے قالب میں ایک یورپین۔''

بہت ہوگیا! میرا سراپا ایک ایسا جال ہے جس نے مجھے شبہات اور تجسس کے پھندے میں گرفتار کر لیا ہے۔ میں سرکس کا جوکر ہوں جو تماشائیوں کی نگاہوں کا مرکز ہے۔ ایک ایسی مخلوق جس کا کوئی ماضی نہیں، اجنبیوں میں ایک اجنبی۔ میرا دل چاہتا ہے کہ بھیڑ میں کہیں گم ہو جاؤں۔

بے تابی کے عالم میں دروازہ کھول کر میں اپنے کمرے کی امان میں آگئی جہاں ہمیشہ کی طرح وہ موجود تھیں۔ وہی گول چہرہ، پیار بھری مسکراہٹ، وہی شفیق پرسکون نیلی آنکھیں۔ انھوں نے اشارہ کر کے مجھے اپنے پاس بلایا اور دھیرے سے کہا، ''Mary Darling''۔

''ہیلو ماما!''

ان کے سنہرے بالوں میں منہ چھپا کر رونے کو دل چاہ رہا تھا۔ میں نے ان سے سارا حالِ دل کہہ سنایا۔ انھوں نے مجھے سینے سے لگانے کے لئے اپنی باہیں پھیلا دیں۔ میں ان کی جانب دوڑی، وہ میری طرف بڑھیں۔ وہ میرے اور نزدیک آئیں اور میں ان کے اور قریب تر ہوگئی۔ میں بس ان کو چھونے ہی والی تھی ....ہم دونوں ٹھنڈے، چمکتے ہوئے شفاف آئینے سے ٹکرا گئے۔

☆☆☆

آخری خواب

منیٰ الذکیر

سبیکا اپنے معمولی سے بستر پر سخت بخار میں پڑی تھی، سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ جب بھی ذرا سا ہوش آتا وہ رونے لگتی اور اللہ سے معافی مانگنے لگتی۔ ''یا اللہ! مجھے معاف کر دے! میرے رازوں کی پردہ پوشی کر اور مجھے ایک صالح موت عطا کر۔''

اسکی ماں اس کے قریب بوسیدہ سے کپڑے پہنے بیٹھی تھیں۔ اوپر سے اس نے جو ثوب (گاؤن نما عربی لباس) پہن رکھا تھا اسکی سنہری کشیدہ کاری بالکل گھس چکی تھی۔ کچن میں کام کرتے وقت لمبی ثوب کا نچلا حصہ جو زمین پر گھسٹ رہا تھا گندا ہو گیا تھا۔ اس نے کمر پر کس کر ثوب میں گانٹھ باندھ لی تھی۔ کھانے کی بو اسکے کپڑوں میں بسی ہوئی تھی۔ وہ اپنی بیٹی پر جھکی ہوئی تھی۔

''لا اللہ الا اللہ! تجھ کو نظر لگ گئی، کسی ایسے کی بدنظر جو ہمارے نبی کا پیرو نہیں ہے۔ اے میری پیاری سبیکا، میری چھوٹی سی ماما، تم میری بات سن رہی ہو؟''

اس نے سبیکا کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ سبیکا نے اپنی بخار میں ڈوبی کالی آنکھیں کھولیں، پلکوں پر آنسو اٹکے ہوئے تھے۔ ''ماں، میرا آخری وقت ہے۔ مہربانی کر کے میری ہر خطا معاف کر دو۔''

''تم نے زندگی میں جو کچھ بھی کیا اس کے لئے پریشان مت ہو۔ میری بچی! اللہ تمھیں اور ہمیں معاف کر دے گا۔''

ماہر کی محبت اسکے رگ و پے میں سمائی ہوئی تھی۔ وہ گرمیوں کی راتوں میں

چھت پر آتی ہوئی ہوا کے ٹھنڈے جھونکے کی طرح تھا۔اب سبیکا کی نگاہیں باہر اس جگہ کو تک رہی تھیں جہاں وہ اس سے ملتی تھی۔

اسکی چھوٹی بہن سرہانے بیٹھی اسکے کالے لمبے بالوں کی چوٹی بنا رہی تھی۔وہ حیران نگاہوں سے ہر طرف دیکھ رہی تھی،اسکی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ماں اتنی ٹوٹی ہوئی کیوں لگ رہی ہے؟ بابا اداسی میں کیوں ڈوبے ہوئے ہیں؟ اس نے سبیکا کی پیشانی سے پسینہ پوچھا۔شام کو چھت پر روئی کے گدے بچھانے اور سب گھر والوں کیلیئے تکیے لگانے کیلیئے،وہ اور سبیکا کتنی بار زینے کی پتھر کی سڑھیوں پر دوڑتے ہوئے چڑھنے کا مقابلہ کیا کرتی تھیں۔ سورج ڈوبنے کے بعد سبیکا سیڑھیاں اتر کر اکیلی نکل جاتی تھی۔اندھیرے میں تھوڑا سا ڈر تو لگتا تھا۔مگر دونوں گھروں کے بیچ میں پتلی سی گلی پار کر کے جا کر ماہر سے ملنے میں نہیں ڈرتی تھی۔

''ماں! میری بہن کو کیا ہو گیا؟ ابھی کل تک تو وہ ٹھیک تھی،چلیں اس کو کلینک لے جاتے ہیں۔''

''نہیں کوئی ضرورت نہیں۔میں حکیم کے پاس سے کچھ جڑی بوٹیاں لے آئی ہوں وہ ابال کر پلاؤں گی تو وہ انشااللہ ٹھیک ہو جائے گی۔''

برسوں سمندر میں غوطے لگا کر موتی نکالنے کی مشقت اور غربت کا مارا ہوا سبیکا کا دبلا پتلا باپ جو چھ چھ مہینے اپنے بیوی اور بچوں سے دور رہا کرتا تھا،سبیکا کے پاس بیٹھا تھا۔اسکے سارونگ (ملیشیا میں لوگ جیسا لباس پہنتے ہیں) کے نیچے سے پیلے رنگ کی تہبند جھانک رہی تھی۔کتنی بار سبیکا کے بھائی مساعد نے اپنے باپ کو سلیپر پہننے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی جس طرح پڑوس کے لوگ پہنتے ہیں مگر وہ ننگے پاؤں رہنا ہی پسند کرتا تھا۔

سبیکا نے ٹھنڈی سانس بھری۔

اسکا باپ پریشان ہو گیا ''میری بیٹی،اللہ تمھیں اپنی امان میں رکھے۔میری چھوٹی سی سبیکا،تم کیسی ہو؟''

''سر میں درد ہے، سر جیسے پھٹنے والا ہے۔''

''اس کے باپ نے زیر لب کہا'' ھوالشافی، بس اسی پر بھروسہ ہے''۔ وہ اسکی پیشانی اپنے کھردرے ہاتھ سے سہلاتے ہوئے دعائیں پڑھتا رہا اور پھر اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

مساعد کہاں ہے؟ بس ایک بار اسے اپنے سرہانے کھڑا دیکھا تھا۔ ایک لمحے کے لئے سبیکا اسکی نگاہوں میں غصے کی جھلک دیکھ کر کانپ گئی تھی۔ اب تو وہ بخار میں پھنک رہی ہے۔

مساعد اکلوتا لڑکا تھا۔ اس کے باپ ہمیشہ اسکی ماں کو ڈانٹتے تھے کہ لاڈ پیار میں اس کو نہ بگاڑے۔ اس نے اسکول کی پڑھائی چھوڑ دی تھی اور سڑکوں پر لڑکیوں کو چھیڑتا پھرتا تھا اور جب رات گئے گھر لوٹتا تھا تو اس کے منہ سے عجیب سی بوُ آ رہی ہوتی تھی۔ ایک بار اسکی ماں نے اسے مارا بھی تھا۔ بہنوں کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا اسے کیوں ڈانٹ پڑتی ہے۔

دلال، اسکی خالہ کی چھوٹی بیٹی اسکے پاس بیٹھی اسے گرم سوپ پلا رہی تھی۔

''اللہ کی قسم سبیکا، تمہیں کچھ نہیں ہوا ہے، بس لاڈ کروا رہی ہو۔''

سبیکا اسکے چھیڑنے پر مسکرائی۔ دلال اسکی دوست اور راز دار تھی۔ دلال سبیکا کو اپنی اسکول کی ساتھیوں کے قصے سنایا کرتی تھی۔ سبیکا کو تو بہت چھوٹی سی عمر میں ہی اسکی ماں نے اسکول سے اُٹھا لیا تھا جب اس نے محسوس کیا تھا کہ سبیکا کا حسن لوگوں کی توجہ کا مرکز بنتا جا رہا ہے۔ پڑوس کی عورتوں نے اشاروں کنایوں میں سبیکا کو اپنے کسی بیٹے کی بیوی بنانے کے خواہش ظاہر کرنا شروع کر دی تھی۔

مساعد ایک دم سے کمرے میں داخل ہوا۔ دلال کی طرف دیکھ کر اسے پکارا وہ فوراً اٹھ کر اسکے پاس گئی۔ وہ اس سے تحکمانہ لہجے میں بات کر رہا تھا اور وہ بس ہاں، ہاں کرتی جا رہی تھی۔ جب وہ چلا گیا تو سبیکا نے کمزور سی آواز میں پکارا'' دلال''

''ہاں، سبیکا۔''

''دلال! مجھے لگتا ہے کہ میں مرنے والی ہوں۔ تمھیں ماہر کے خطوط یاد ہیں؟ ان کو پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کردو۔ وہ میرے کپڑوں کے نیچے لکڑی کے ایک ڈبے میں رکھے ہیں۔ میں اپنے پیچھے تاریک یادیں نہیں چھوڑ کر جانا چاہتی۔ میں چاہتی ہوں کہ میری ماں جب مجھے یاد کرے تو میرے حق میں دعا ہی کرے۔ جاؤ اور جلدی سے وہی کرو جو میں نے تم سے کہا ہے۔''

سبیکا کو یاد ہے جب اس نے ماہر کو پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ یوں ہی وقت گزاری کے لئے دروازے کی دراز سے باہر گلی میں لوگوں کو آتا جاتا دیکھ رہی تھی۔ ماں اس وقت محلے میں اپنی بنائی ہوئی روٹیاں اور مٹھائی بیچنے کیلئے گئی ہوئی تھی تاکہ گھر کے خرچ میں کچھ مدد ہوجائے۔ اور ابّا اپنے پرانے دوستوں کے ساتھ قریب کی دکان پر چائے پینے گئے ہوئے تھے، چھوٹی بہن پڑوسن کی بیٹی کے ساتھ اسکول گئی ہوئی تھی۔

انھوں نے اسے اسکول سے اسلئے جلدی اٹھالیا تھا تاکہ اسکی جلد از جلد شادی کردیں مگر اسکے پڑوسی ماہر کی ایک جھلک نے اس کا دل چرالیا۔

اسکا جیسا گورا رنگ سبیکا نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، لمبے قد کا سجیلا لڑکا جس کے بال اور مونچھیں سنہری تھیں۔ وہ دل و جان سے اسے چاہتی تھی۔ وہ روز اس وقت کا انتظار کرتی تھی جب وہ اپنے کام سے واپس آتا تھا۔ جلد ہی اسے بھی اندازہ ہو گیا۔ وہ اپنے گھر میں داخل ہونے سے پہلے اپنے قدم آہستہ کردیتا اور اپنی ایک مسکراہٹ سے اس کے دل کا چین لوٹ لیتا۔

دن گذرتے گئے اور وہ اس کے حسن اور وجاہت کی پرستش کرتی رہی۔ اس کی شکل اردگرد کے تھکے ہوئے چہروں سے مختلف تھی۔ اسکی آنکھیں بے جان سی کالی آنکھوں سے کتنی مختلف تھیں، بالکل مختلف۔ اسکی آنکھیں بہت شفاف اور حسین تھیں۔ وہ طے نہیں کر پاتی تھی کہ اس کی آنکھوں کا اصلی رنگ کیسا ہے۔ اس کی ایک

جھلک ہی اس کے لئے کافی تھی، جیسے اس کے دل کو پر لگ جاتے تھے۔

سبیکا نے بستر میں کروٹ بدلی، حسین یادوں نے پھر دل کو گدگدانا شروع کردیا تھا.......ایک بار وہ ہمت کر کے دروازے کے قریب آ ہی گیا تھا۔سبیکا نے ایک چمکیلی مسکراہٹ سے اسکی اس ہمت کا تحفہ کچھ اس طرح دیا تھا کہ وہ جھوم اٹھا۔ وہ یہ راز اپنے دل میں نہیں چھپا سکی، اس نے سب کچھ دلال کو بتا دیا تھا۔خوشی سے چوُر اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اسے ایک نئی زندگی ملنے والی ہے۔مسرتوں کی بشارت لئے کہیں دور روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔خواہشات نے کچھ دھندلی سی تصویریں بنانا شروع کردیں تھیں۔مسرت سے لبریز وہ دن بھی کیسے تھے۔

دلال کی پیاری سی ہنسی اس سے پہلے گھر میں داخل ہوئی تھی۔اسنے اپنی خالہ کے دونوں گالوں پر بوسہ دیا اور آ کر سبیکا کے پاس بیٹھ گئی تھی۔سبیکا اس وقت آنگن میں بیٹھی اپنے لمبے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی جو کسی جادوئی سیاہ جھرنے کی طرح اس کے کاندھوں پر پڑے تھے۔وہ کنگھی کرتے ہوئے، کہیں دور خوابوں میں کھوئی ہوئی تھی۔قریب ہی لکڑی کے شیلف پر رکھے ہوئے ریڈیو پر گیت بج رہا تھا۔

کھڑی ہو جاؤ، رقص کرو

اپنا نقاب اتار دو

تا کہ میں تمہیں دیکھ سکوں، اپنی آنکھوں کی پیاس بجھا سکوں

دلال نے چپکے سے کہا تھا،

''چلو تمہارے کمرے میں چلتے ہیں''

اور وہ چوٹی باندھتی ہوئی اس کے پیچھے چل پڑی تھی۔اس کا دل کہہ رہا تھا کہ دلال اچھی خبر لائی ہے۔دلال نے اپنے کرتے میں چھپا، تہہ کیا ہوا ایک خط نکال کر دیا تھا۔سبیکا نے ہنستے ہوئے خط اسکے ہاتھ سے اچک لیا تھا۔دھڑکتے ہوئے دل سے، دونوں ہاتھوں میں خط مضبوطی سے تھام لیا تھا۔

پھر اس نے خط کو چوم کر کھول کر پڑھا تھا۔ ماہر نے محبت کی ایک داستان اسکی نذر کی تھی۔ وہ جھوم اٹھی تھی، ناچنے لگی تھی، اسکی چوٹی گردن میں لپٹ گئی تھی۔

''تمہیں پتہ ہے، مجھے محبت ہوگئی''، وہ ناچتے ہوئے کہتی جاتی تھی۔

ایک لمحے کیلئے دلال کے چہرے پر ہلکی سی حاسدانہ مسکراہٹ آئی تھی، اسے کیوں کوئی محبت نامہ لکھنے والا نہیں ملتا؟ مگر فوراً ہی اس نے دماغ سے یہ خیال جھٹک دیا تھا۔ وہ سبیکا سے واقعی بہت پیار کرتی تھی۔

دلال ان کی نامہ بر بن گئی تھی۔ ایک بار ماہر نے دلال سے پوچھا تھا ''سبیکا نے اتنی جلدی اسکول کیوں چھوڑ دیا؟''

''کیونکہ وہ بہت خوبصورت ہے، میری خالہ نہیں چاہتیں کہ وہ خواہ مخواہ ہی لوگوں کی نگاہوں میں آئے۔ وہ اسکی کسی امیر آدمی سے شادی کرنے کی تیاریاں کر رہی ہیں۔''

ماہر کو دھچکا سا لگا، یہ خیال تو اسے آیا ہی نہیں تھا۔ سبیکا تو اس کے لئے ایک حسین سراب یا خواب تھی۔ اس نے سبیکا کو خط میں شادی کے بارے میں لکھا اور پوچھا کہ اس کی کوئی امید ہے؟ اس نے اپنے دوستوں سے سن رکھا تھا کہ یہاں کی لڑکیوں کی شادیاں غیروں اور اجنبیوں میں نہیں ہوتی ہیں۔ وہ کرے تو کیا کرے؟

سبیکا بہت روئی تھی، وہ جانتی تھی کہ کوئی امید نہیں ہے۔ مگر وہ اس سے ہی محبت کرتی تھی اور وہ ہی اسکی پسند تھا۔ وہ اپنے دل میں کسی اور کو جگہ ہی نہیں دے سکتی تھی۔ اس کے بغیر زندگی بے معنی تھی۔

سبیکا بہت دکھی ہوگئی، کھانا پینا بھی چھوٹ سا گیا تھا۔ جیسے وہ بن کچھ کہے حالات کے خلاف احتجاج کر رہی تھی۔ اس کی ماں نے جب دیکھا کہ وہ روز بروز دبلی ہوئی جا رہی ہے تو اس نے مسکرا کر کہا تھا،

''کوئی بات نہیں، جلدی ہی تمہاری شادی ہو جائے گی، امّ صالح اپنے بیٹے کے لئے تمہارا رشتہ مانگنے آئے گی۔ وہ لوگ امیر ہیں، انکی بڑی سی کمپنی ہے جو حج

کرانے کا انتظام کرتی ہے۔''

''میں شادی نہیں کرنا چاہتی''سبیکا کی چیخ بے آواز تھی۔

اس کے بجائے اس نے کہا'' اماں، آپ کو پتہ ہے، دلال کہہ رہی تھی کہ اس کے اسکول میں ایک بہت اچھے خاندان کی لڑکی ہے جس نے اس علاقے کے باہر کے ایک نوجوان سے شادی کر لی ہے۔''

'' کیا ؟ اللہ شیطان سے بچائے، بس قیامت آنے والی ہے، کیا ہمت ہے، اس شیر کی بچی کے گھر والے کہاں ہیں؟'' ماں اتنے زور سے چلائی کہ سبیکا خاموشی سے ہار گئی۔

سبیکا نا قابل برداشت تکلیف سے چلائی'' اماں ! اماں! مجھے بچاؤ، میں مر رہی ہوں''۔

اسکی ماں دوڑی ہوئی اسکے پاس آئی'' ہاں میری بیٹی ! ہاں میری بچی'' اور سبیکا کو زور سے لپٹا لیا جیسے وہ اسکے ہاتھوں سے نکلی جا رہی ہو۔ اسکا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ گیا۔ اس کا باپ دوڑا آیا، اس کی تہبند اسکی ٹانگوں میں الجھی جا رہی تھی۔ انھوں نے سبیکا کے چہرے کی طرف دیکھا۔ پہلی بار اسے موت سے ڈر لگا جو اس وقت اسکی سب سے خوبصورت اولاد پر منڈلا رہی تھی۔ جب وہ موتیوں کی کھوج میں ناؤ لے کر نکلا کرتا تھا اور اس کے کسی ساتھی کی موت ہو جاتی تھی تو وہ اسکو سفید کپڑے میں لپیٹ کر سمندر کی نذر کر دیا کرتا تھا۔ وہ اس وقت اپنی بیٹی سبیکا کو مضبوطی سے تھامے ہوئے تھا، وہ اسکو دوسروں کی طرح غرق نہیں ہونے دے گا۔

''میری بیٹی، میری بچی'' وہ اسکے دونوں شانے اس طرح تھامے ہوئے تھا جیسے اسے کسی گہرے سمندر سے باہر نکالنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اسکے آنسو سبیکا کی تپتی پیشانی پر گر رہے تھے۔

سبیکا کے ہونٹوں سے ایک کمزور اور خوفزدہ سی چیخ نکلی۔ اس کے باپ کو وہ

دن یاد آ گیا جب وہ رسی جو غوطہ خوروں کی کمر سے بندھی ہوتی ہے اسکی گردن، شانوں اور بازوؤں پر لپٹ گئی تھی، جیسے کوئی کالا کیکڑا اسے دبوچے ہوئے ہو۔ اس نے اپنی ناک پر لگا ہوا بکسوا (کلپ) نکال دیا تھا۔ اسکے پیٹ میں بہت سا پانی بھر گیا تھا، دم گھٹا جا رہا تھا۔ وہ بمشکل تیرتا ہوا اوپر آیا تھا تب روشنی اور ہوا میسر ہوئی تھی۔ اسے لوگوں نے ناؤ پر سیدھا لٹا دیا تھا، بہت سے ہاتھ اسکو چھو رہے تھے۔ اس نے ایک لمبی سانس لی تھی اور زندگی کی طرف لوٹ آیا تھا۔

پتھر جیسا چہرہ لئے اس کا بھائی مساعد پاس کھڑا تک رہا تھا۔ ''کیا میرے بھائی کو کچھ پتہ چل گیا ہے؟'' سبیکا سوچ رہی تھی۔ اسے پتہ تھا کہ اس کے بھائی کو بہت غصہ تھا کہ ابو فہد نے ان کے پڑوس والا مکان، اجنبی اور وہ بھی غیر شادی شدہ لوگوں کو کرائے پر کیوں دے دیا تھا۔ وہ دلال کی طرف عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ کیا دلال نے اسے بتا دیا؟ اب وہ ہمیشہ مجھ سے نفرت کرے گا۔ مجھے معاف نہیں کرے گا۔ مساعد کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس کی چھوٹی بہن اسکے پاؤں کے پاس بلّی کی طرح بیٹھی تھی۔ اس کی ماں نے آٹے سے سنا ہوا ہاتھ اسکی تپتی ہوئی پیشانی پر رکھا جو تندور سے نکلی ہوئی روٹی کی طرح پھنکتی ہوئی تھی۔ اس کا دل جھلنے لگا، اب اس کے بعد تو اس کو تندور بھی گرم نہیں لگے گا۔

ماہر...... ماہر اپنی روشن مسکراہٹ ہوئے موجود تھا۔ وہ قریب آیا اور اس کی جلتی ہوئی پیشانی کو چوما۔ پھر اسکے چہرے سے سر اٹھا کر دور ہوتا گیا...... وہ اندر آیا کیسے..... اس نے اتنی ہمت کیسے کی........ اتنی بندشیں پار کر کے وہ کیسے آ گیا؟ شاید اس کو نیند کی جھپکی آ گئی ہوگی۔ وہ تو ہمیشہ ہی اسکے خواب دیکھتی تھی۔ یہ محبت ہے، محبت........

اسکی آنکھیں انوکھی روشنی سے منور ہو گئیں، چہرہ پرسکون ہو گیا، اور نگاہیں

کہیں دور دیکھ رہی تھیں۔

اسکی ماں کو اپنا لڑکپن یاد آ گیا، جب سبیکا کے باپ سے اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ وہ ایک کمسن لڑکی تھی، ایک پرانی سی بالٹی لے کر کنویں سے پانی بھر کر لاتی تھی۔ وہ اس سے اپنی پیاس بجھا سکتی تھی مگر اسے کنویں کی گہرائی سے ڈر لگتا تھا، وہاں صرف اندھیرا تھا۔ پراسرار اور گہرا اندھیرا.........پھر ایک چیخ بلند ہوئی۔

ماہر جانتا تھا کہ یہ کیسی چیخ ہے، کیا ہوا ہے۔ زندگی کا سرچشمہ خشک ہو گیا، محبت کا دروازہ ہمیشہ کیلئے بند ہو گیا۔ لرزتی ہوئی انگلیوں نے محبت سے لبریز آنکھوں کے پپوٹے بند کر دئے۔

کھیل

سارہ بوحیمد

اس نے کمرے کی سب روشیاں بجھادیں اور دیوار کو ہاتھ سے ٹٹول کر چلنے لگی تا کہ فرنیچر سے نہ ٹکرائے۔ اندھیرے میں کمرے کے ایک کونے میں رکھے ہوئے ٹیلی فون کی گھنٹی بجے جارہی تھی، بجے ہی جارہی تھی، فون منت کئے جارہا تھا کہ کوئی اسے اٹھا لے۔ ہاں! فون اس اندھیرے میں اس کے جذبات کو جگانے کی کوشش کرر ہا تھا، ضد کرر ہاتھا۔ مگر نورا نے اسے یوں ہی رونے اور سسکنے دیا۔ وہ ہرگز فون نہیں اٹھائے گی۔

وہ جانتا ہے کہ یہ بالکل صحیح وقت ہے...... وہ خوبصورت الفاظ چن کر اس کی کانوں میں ٹپکائے گا جو سیدھے اس کے دل میں اتر جائیں گے۔ وہ ہمیشہ صحیح وقت کا انتخاب کرتا ہے، وہ گھر میں اسکی نقل وحرکت سے واقف ہے، خوب جانتا ہے کہ کس وقت سب لوگ آرام کرر ہے ہوں گے۔ اس نے چشمِ تصور سے دیکھا کہ وہ فرش پر بیٹھا ہے، پاس ہی اسٹیریو پر کوئی میٹھی سی دھن بج رہی ہے اور وہ سرگوشیوں میں بہت رومانی باتیں کرر ہا ہے۔

نہیں، ہزار بار، نہیں! وہ اسے بیوقوف بنانے کا ایک اور موقع ہرگز نہیں دے گی۔ وہ اس قصے کو ختم کر دے گی، عاجز آگئی ہے اس کی ٹال مٹول سے، اس لمبے انتظار سے۔ وہ کسی منچلے لڑکے کی طرح اس سے صرف تفریح کرر ہا ہے۔ اگر وہ واقعی اس سے محبت کرتا ہے اور اس معاملے سنجیدہ ہے تو آگے آتا اور اسکے گھر والوں سے باقاعدہ اس کا ہاتھ مانگتا۔ اس میں تو کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔

ان کی پہلی ملاقات بک اسٹور میں ہوئی تھی۔ وہ ایک کتاب ڈھونڈ رہی تھی جس کی اس کو ضرورت تھی۔ اسے محسوس ہوا کہ نزدیک ہی دو آنکھیں اس کو مستقل دیکھ رہی ہیں۔ اس نے فوراً نقاب ڈال لی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تک نہیں کیونکہ وہ اک سنجیدہ سی لڑکی تھی، دوسری لڑکیوں کی طرح نہیں تھی۔ اس نے وہ کتاب وہیں چھوڑی اور اسٹور سے باہر نکل گئی۔

دوسرے دن جب وہ بک اسٹور واپس گئی کہ مطلوبہ کتاب خرید لائے، تو وہ حیران ہوگئی کہ وہ ہی لڑکا موجود تھا۔ وہاں وہ ہی کھڑا تھا۔ وہ وہی کتابیں الٹ پلٹ رہا تھا جو کل وہ چھوڑ گئی تھی۔ جیسے ہی وہ اسٹور میں داخل ہوئی تو وہ اسکی طرف دیکھ کر مسکرایا اور ''اسکی جگہ'' اس کے لئے چھوڑ کر باہر نکل گیا۔

کافی دن گذر گئے تب ایک بار اس نے اپنی ایک سہیلی کو اسی نوجوان کے ساتھ سڑک پر جاتے دیکھا، وہی جسے بک اسٹور میں دیکھا تھا۔

''عجب اتفاق ہے'' نورا ہنس پڑی اور بعد میں اس نے اپنی سہیلی سے پوچھا، ''تم نے کبھی مجھے بتایا ہی نہیں کہ تمہاری شادی ہوگئی ہے، تو میں تم کو مبارک باد کیسے دیتی؟''

''خدا تمہاری زبان مبارک کرے! مگر جس آدمی کے ساتھ تم نے مجھے دیکھا تھا وہ میرا بھائی ہے، احمد۔ میری ابھی شادی نہیں ہوئی ہے۔''

نورا یہ بات مانتی ہے کہ یہ سن کر اسے خوشی ہوئی تھی۔ اسکی سہیلی کئی بار ملنے آئی اور اپنے بھائی کے بارے میں باتیں کرتی رہی کہ وہ نورا کو بہت پسند کرتا ہے، کیا وہ اسے فون کرسکتا ہے؟ وہ شادی کا باقاعدہ پیغام دینے سے پہلے اس سے بات کرنا چاہتا ہے۔

نورا نے سوچا کہ اس میں تو کوئی قباحت نہیں ہے، گھر والوں کی اجازت کی خاص ضرورت بھی نہیں۔ لہذا نورا نے اپنی سہیلی کو مناسب وقت بتا دیا جب وہ اسے فون کرسکتا ہے۔ اور اس کے بعد وہ اسے روز شام کو فون کرنے لگا۔ نورا کو یہ کھیل اچھا

لگنے لگا۔ کئی مہینے گذر گئے مگر وہ مستقل اسکے گھر والوں سے ملنے اور بات کرنے کے معاملے میں ٹال مٹول کرتا رہا۔ پھر تو اسے یہ یقین ہو گیا کہ وہ صرف تفریح لے رہا ہے۔ وہ خود کو قصوروار سمجھنے لگی۔ اسکے ابّا اور بھائی جب ان ٹیلی فون کالوں کے بارے میں سنیں گے تو کیا کہیں گے؟ وہ ان کا سامنا کیسے کرے گی؟ وہ کیا بہانہ بنائے گی؟ وہ جانتی تھی کہ اس نے غلطی کی ہے۔ اس سے پہلے کہ یہ کھیل اسے بدنام کردے اسے بند کرنا ہوگا۔ اب تک جو بھی ہوا اسکے لئے اللہ اسے معاف کرے۔ اس نے فون کی گھنٹی کی آواز پر اپنے کان بند کر لئے تھے۔ وہ اب فون کی آواز پر دوڑ کر نہیں جاتی ہے۔ وہ یہ آواز سنتی ہی نہیں۔

دن اور ہفتے کیسے تیزی سے گذرتے رہے اسے پتہ ہی نہ چلا۔ اس نے خود کو اسکول کی پڑھائی میں مشغول کرلیا۔ سردیوں کی چھٹیاں ہونے والی تھیں اور اس کے بھائی باہر جانے کا پلان بنا رہے تھے۔ اس نے ان سے ساتھ جانے کے لئے کہا مگر انھوں نے مذاق میں ٹال دیا۔

ایک دن دروازے پر دستک ہوئی اور کوئی ایک شادی کا دعوت نامہ دے گیا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں اور دھڑکتے دل سے لفافہ کھولا۔ وہ پڑھ کر حیران رہ گئی۔

''ہمارے بیٹے احمد کی شادی خانہ آبادی، آنسہ میئی کے ساتھ........''

اس کے ہاتھ سے لفافہ گر گیا۔

☆☆☆

میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا

تماشہ العلیان

نئی انجانی دنیا کے شوق اور الجھن کے ملے جلے جذبات سے لبریز میرا دل جیسے کہیں بھاگا جا رہا تھا۔ ریڈیو پر عبدالکریم عبدلقادر اپنا مشہور گانا گا رہا تھا۔ ''الوداع! اے گذری ہوئی شب، جس میں ہم ساتھ تھے .... الوداع جان سے پیاروں الوداع۔'' گرم آنسو میرے چہرے کو بھگونے لگے اور پھر ماما کا بھی رونا شروع ہو گیا۔

''بیٹی! تم پہلی لڑکی تو نہیں ہو جو شادی ہو کر دور جا رہی ہو۔ سب لڑکیوں کی شادی ہوتی ہے'' ابا نے کہا اور پھر وہ ماما پر چلانے لگے،

''ارے کیا مصیبت ہے، سواد کی شادی ہو رہی ہے، موت نہیں۔ تمھیں تو بچی کو پریشان کرنے کے بجائے اسکی ہمت بندھانی چاہئے۔'' پھر انھوں نے مجھ سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا،

''دیکھو! میں نے تمھیں پہلے بھی سمجھایا تھا کہ اپنے شوہر کی قدر کرنا، عزت کرنا۔ وہ ہی تمہاری آگے کی زندگی ہے۔ فکر مت کرو، دو سال بعد تم سعودی عربیہ واپس آجاؤ گی۔'' پھر کچھ دیر خاموشی کے بعد اداس آواز میں بولے،

''ہم کو بھی تمہاری جدائی شاق ہوگی، میری بیٹی، جیتی رہو، خوش رہو۔''

بیوٹی سیلون کے سامنے کار رک گئی۔ اماں نے اور میں نے چہرے پونچھ لئے۔ ابا نے کہا ''میری نصیحت یاد رکھنا۔''

میرا دل گھڑی کی طرح ٹک ٹک کر رہا تھا۔ سیلون میں کام کرنے والیوں نے مجھے گھیر لیا۔ ایک نے پیروں کی مساج شروع کر دی، دوسری نے بالوں کو سنوارنا

شروع کر دیا، تیسری نے فیشل کرنا شروع کر دیا۔ ماں کے آنسو اب بھی نہیں رک رہے تھے، چہرہ لال ہو رہا تھا، ناک سوج گئی تھی۔ میں ان سے بہت محبت کرتی ہوں اور وہ بھی اپنی اولاد میں مجھے ہی سب سے زیادہ چاہتی ہیں۔

پورے دس بجے انھوں نے مجھے تیار کر دیا اور اپنی محنت کو سراہنے لگیں۔ ماما نے رندھے ہوئے گلے سے کہا ''کتنی پیاری لگ رہی ہو میری جان۔ اتنی خوبصورت دلہن تو میں نے زندگی میں نہیں دیکھی۔''

''ہر ماں یہ ہی اپنی بیٹی سے کہتی ہے۔'' ہیئر ڈریسر نے ہنستے ہوئے کہا۔

پھر ہم ہوٹل کی طرف چلے جہاں میرا دولہا پہلے ہی پہنچ گیا تھا۔

میرے شوہر! ان سے میں پہلی بار نہیں مل رہی تھی۔ جب وہ میرے بابا سے میرا ہاتھ مانگنے آئے تھے تو میں نے انھیں دیکھا بھی تھا اور بات بھی کی تھی۔

شادی کی رسموں کے بعد جب ہم ائیر پورٹ کے لئے ٹیکسی میں روانہ ہوئے تو انھوں نے میرا ایک ہاتھ تھاما ہوا تھا، دوسرا ہاتھ ہلاتے ہوئے میں گھر والوں کو الوداع کر رہی تھی۔ ان کے آنسوؤں کی جھلملاہٹ مجھے گھیرے ہوئے تھی۔ میں نے اپنے آنسو پونچھے، بیوٹیشین نے مجھے نہ رونے کی تاکید کی تھی۔ میں نے خود سے کہا ''ہمت سے کام لو''۔ میں نے ہمت سے کام لیا اور ساری رات روئی نہیں۔

لندن کی فلائٹ میں ظاہر ہے ہم دونوں پاس پاس بیٹھے تھے۔ دوسرے مسافر ہمیں شوق و تجسس سے دیکھ رہے تھے۔ میرے شوہر نے جھک کر مجھ سے سرگوشی کی، میں نروس سی ہو گئی۔ وہ کہہ رہے تھے،

''میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں، اور امید ہے کہ تم بلا جھجک اور ایمانداری سے جواب دو گی۔''

''کیا'' میں نے دھیرے سے کہا،

''مجھ سے پہلے کیا کوئی مرد تمہاری زندگی میں تھا؟''

میں ایسے سوال کی توقع نہیں کر رہی تھی، حیران رہ گئی۔ میں سوچنے لگی..........

یہ کوئی بہت پرانی بات نہیں، پانچ سال پہلے ہی کی تو ہے۔ میں نے اپنی ماں سے اپنی سہیلی لیلیٰ کے ساتھ مل کر پڑھائی کرنے کی اجازت مانگی۔ حسب عادت میری ماں نے انکار نہیں کیا۔ میں نے کبھی ماں کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائی تھی۔

جب ہم پڑھ کر تھک گئے تو اچانک لیلیٰ نے کہا،

''سواد، چلو ٹیلی فون پر تفریح کریں۔''

میں جانتی تھی اسکا مطلب کیا ہے مگر میں ڈر رہی تھی، میں نے کبھی ٹیلی فون پر یا کسی اور طرح غیر مردوں سے بات نہیں کی تھی۔

''بالکل بیوقوفی کی بات ہے'' میں نے کہا تھا۔ ''میری ماما کہتی ہیں کہ فون پر کھیل کھیلنا خطرناک ہو سکتا ہے۔''

''چلو بڈھوں کی سی باتیں چھوڑو'' لیلی نے کہا اور میرا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی فون کے پاس لے گئی۔ ''چلو آؤ''۔

اس نے ایسے ہی کوئی نمبر ملایا اور فون کا اسپیکر آن کر دیا۔ ایک لڑکے کی آواز آئی۔ لیلیٰ نے بہت بے باکی سے اس سے بات کی اور پھر ریسیور میری گود میں پھینک دیا جو میں نے واپس اس کی طرف پھینک دیا۔ وہ میرا مذاق اڑاتے ہوئے ہنس کر بولی،

''ڈرپوک لڑکی! بات تو کر کے دیکھو۔''

میں نے ریسیور کی طرف دیکھا، اک عجب سی لطیف تھرتھری جسم میں ہو رہی تھی۔ اس نے میرا نام پوچھا۔ میں ذرا جھجکی، لیلیٰ نے اشارے سے کہا، ''فرضی نام'' سو میں نے ایک نام گھڑ لیا۔

''میرا نام ہشام ہے'' اس نے کہا ''میں ایک لڑکی سے بات کرنا چاہتا ہوں، دو سے نہیں۔''

لیلیٰ نے مجھے آنکھ مار کر اشارہ کیا کہ میں ہی بات کروں۔

کچھ ہی دنوں میں مجھے لگنے لگا کہ جیسے میں بادلوں میں اڑ رہی ہوں، ستاروں کے جھرمٹ میں ہوں۔ میں خوشی سے سرشار رہتی تھی۔

پھر وہ مجھے دن میں دو بار فون کرنے لگا۔ ایک بار جب میں اسکول سے واپس آتی تھی اور دوسری بار رات کو جب سارے گھر والے سوجاتے تھے۔ میں فون کے قریب بیٹھ کر گھنٹی بجنے کا انتظار کرتی رہتی تھی۔ فون کی گھنٹی کا ہمارا ایک ایک مخصوص کوڈ بن گیا تھا۔ پھر ہم گھنٹوں بات کرتے، کبھی رات بھر باتیں ہوتیں یہاں تک کہ صبح ہو جاتی۔

میں اپنی اس دنیا میں ڈوبی رہتی تھی، پڑھائی پر بھی توجہ نہیں رہی تھی، دوستوں سے دور ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ لیلیٰ سے بھی کنارہ کشی کر لی تھی کہ کہیں وہ میرے چاہنے والے کو چھین نہ لے۔

ایک دن ہشام نے پوچھا کہ وہ مجھ سے کب مل سکتا ہے۔ میں نے انکار کر دیا مگر وہ اصرار کرتا رہا۔ "مجھے اس بارے میں سوچنے دو" میں نے اس سے کہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں خوبصورت ہوں مگر یہ بھی خوب سمجھتی تھی کہ اگر میں اس سے کہیں جا کر ملی تو آفت آسکتی ہے اور ضرور آئے گی۔ شاید وہ مغربی طرز کا "گڈ ٹائم" گذارنا چاہتا تھا جس کی ہماری تہذیب اجازت نہیں دیتی۔ "نہیں" میں نے سختی سے منع کر دیا۔

"تو پھر میں آئندہ سے تمھیں فون نہیں کروں گا۔" اس نے کہا تھا۔

اور پھر اس نے فون نہیں کیا۔ طویل اور بورنگ خالی خالی دنوں میں عجب بے کلی سی رہتی تھی، میں اسکی آواز سننے کو بے تاب رہتی تھی۔ مجھے لگا کہ میں اس سے محبت کرنے لگی ہوں۔

دو ہفتے بعد میں نے اسکو فون کیا میں تو رو پڑی۔ اس نے پھر وہی فرمائش دہرائی۔ میں نے کہا کہ مجھے ڈر لگتا ہے تو اس نے کہا،

"تو پھر مجھے اپنی تصویر دے دو"۔

میں ساری رات اپنی کوئی اچھی سی تصویر ڈھونڈتی رہی۔

ہمارے طے شدہ پروگرام کے مطابق اس نے اپنی کار اسکول کے پاس کھڑی کی اور میں نے بظاہر بے نیازی سے گذرتے ہوئے اپنی تصویر کار کی کھڑکی

سے اندر پھینک دی۔

اس رات اسنے فون پر بہت پیاری محبت بھری باتیں کیں۔ ''میں نے آج تک تم سے زیادہ خوبصورت لڑکی دیکھی ہی نہیں۔ میں تمہاری تصویر دیکھ کر ہم دونوں کی شادی کے خواب دیکھنے لگا۔ سوچنے لگا کہ ہماری شبِ عروسی کیسی ہوگی۔''

کچھ دن بعد اس نے پھر ملاقات کی بات چھیڑی۔ ''تمہارے پاس میری تصویر تو ہے'' میں نے کہا ''یا یہ کافی نہیں؟ اسے ہی دیکھ کر دل بہلاؤ۔''

''میں تم سے ملنا چاہتا ہوں'' وہ اصرار کرتا رہا۔ ''یہ بہت ضروری ہے۔ میں کسی جگہ تمہارا انتظار کروں گا۔''

''ہشام، تم پاگل ہو گئے ہو کیا؟ سوری! میں تم سے نہیں مل سکتی۔''

''تو ٹھیک ہے پھر جو تمہاری تصویر میرے پاس ہے اسے استعمال کر کے میں واقعی تمھیں ''سوری'' کر دوں گا۔'' اس نے مجھے دھمکی دی۔

اسی لمحے میں سمجھ گئی کہ اس کے لئے محبت صرف ایک بے معنی لفظ ہے۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسکی دھمکی اور اپنی پریشانی کا کیا کروں۔ پھر میں لیلیٰ کے پاس گئی اور اس کو سب کچھ بتایا۔

''کیوں نہیں؟'' اس نے مشورہ دیا ''مل لو اس سے! ہو سکتا ہے وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہو۔''

مجھے دھچکا سا لگا، میں لیلیٰ کو کوئی جواب بھی نہیں دے پائی۔ میں اپنی پیاری ماما کے پاس گئی اور ان کے کندھے پر سر رکھ کر بہت روئی اور سب کچھ بتا دیا۔

انھوں نے مجھے پیار سے لپٹا کر کہا ''مجھے اس سے نپٹنے دو۔ اسے فون ملاؤ۔''

میں نے فون ملایا۔ ''ہیلو! تو آخر کار تم مان ہی گئیں'' اس نے بہت چہک کر کہا ''تو ہم کب مل رہے ہیں؟''

میری ماما نے فون لے لیا ''ہمارے گھر آپ کی تشریف آوری ہمارے لئے باعث مسرت ہوگی ہشام میاں۔ کب آرہے ہیں؟''

اس نے فون بند کر دیا اور پھر کبھی فون نہیں کیا۔
اس تلخ تجربے نے مجھے بہت سے سبق سکھائے مگر اس تجربے کے بعد میں ایک زیادہ سمجھ دار اور ہمت والی سواد بن گئی۔ میں نے لیلیٰ سے بھی ملنا چھوڑ دیا۔ کئی سال گذر گئے اور میں سب کچھ بھول بھال گئی۔
مگر اب آج جب میرے شوہر، ہماری شادی کے پہلے دن مجھ سے یہ سوال پوچھ رہے ہیں۔ میں ان سے جھوٹ نہیں بولوں گی۔ مگر ہشام والا تجربہ کوئی سچی محبت تو نہیں تھا۔ اور ہشام تو مرد کہلانے کے لائق بھی نہیں تھا۔ اسلئے میں پورے اعتماد کے ساتھ اپنے شوہر کو جواب دے سکتی ہوں۔ وہ میرے جواب کا بے تابی سے انتظار کر رہے ہیں۔
میں نے ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سرگوشی کی،
''نہیں کبھی نہیں! آپ سے پہلے میری زندگی میں کوئی مرد نہیں آیا۔ آپ ہی پہلے ہیں اور آخری بھی۔''
وہ خوشی سے مسکرائے اور میں ان کی طرف جھک کر مسکرائی۔

☆☆☆

مجھے ساتھ لے چلو

نجاۃ خیاط

''مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی میری جان۔ تنہائی مجھے کھا جائے گی، دل میں وسوسے ڈالے گی۔''

مگر ماہر نے اسکی امید کی ٹمٹماتی لو بجھا دی، دھیرے سے بولا،

''میری جان، خود کو سنبھالو۔ میں جلدی ہی واپس آجاؤں گا۔'' ہزار ضبط کے باوجود اسکے گال پر بھی ایک آنسو بہہ نکلا، وہ بھی جذبات سے مغلوب تھا۔ اس نے خود کو سنبھال کر کہا،

''صحرا میں لگے خیمے میں تم نہیں رہ پاؤ گی۔ وہاں آگ برساتا سورج اور ریت کی آندھیاں ہوں گی۔''

ضحیٰ نے اسکی بات کاٹی ''میں تمہارے ساتھ کہیں بھی جا سکتی ہوں۔ بس میں تمہارا ساتھ چاہتی ہوں، تمہاری آواز، جسم کی خوشبو تمہاری موجودگی کا احساس دلاتی رہے گی۔ تمہارے ساتھ صحرا کی صعوبتیں بھی آسان ہو جائیں گی۔ میرے ہاتھ تمہارے ماتھے کا پسینہ پونچھ لیں گے...... تمہاری سخت پیاس بجھانے کے لئے میں شربت تیار رکھوں گی۔ ایسے ہی چھوٹے چھوٹے کاموں میں لگی رہوں گی تو تمہارے سوا کسی اور چیز کی ضرورت ہی نہیں ہوگی، پلیز! مجھے یہاں اکیلے رہنے کی سزا مت دو، صرف اپنے لئے کھانا پکانا اور صرف اپنے لئے جینا میں برداشت ہی نہیں کر سکتی۔ تمہارے خط کے انتظار میں ایک ایک دن شمار کرنا، پوسٹ مین کا انتظار کرنا میں کیسے برداشت کروں گی۔ میں یہ سب نہیں سہہ سکتی۔''

اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ ماہر نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

''میری جان، بچپنا چھوڑو، تمہارا وہاں جانا میرے کام میں رکاوٹ ڈالے گا۔ میرا کام بہت نازک ہے اور بہت توجہ چاہتا ہے۔ میں خود تمہارا قرب چاہتا ہوں مگر میرے لئے یہ ہی بہت ہے کہ تم حفاظت سے ہو۔ جب بھی موقع ملے گا میں خط لکھوں گا۔ ایک مہینے میں واپس آؤں گا تو تم مجھے خوشیاں دینے کے لئے بے تابی سے میرا انتظار کرتی ہوئی ملو گی۔'' اس نے مجھے زور سے لپٹا لیا تھا۔

ماہر زمین کی تہہ میں تیل کی تلاش کرنے چلا گیا۔ بڑی بڑی ڈرل مشینیں ریت کی لہروں میں چھپی سخت زمین کا سینہ کاٹ رہی تھیں۔ ڈرل مستقل اندر باہر ہو رہی تھی۔ سورج اپنی تیز شعاعیں کام کرنے والوں پر برسا رہا تھا۔ وہ سب کام میں مصروف تھے، چل پھر رہے تھے، دیکھ بھال رہے تھے، سب کچھ نارمل تھا۔

ماہر اپنے چھوٹے سے خیمے میں مائیکرواسکوپ کے نیچے کالے رنگ کے پتھروں کے نمونوں کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس نے جو کچھ دیکھا تو اس سے اسکے پسینے چھوٹ گئے۔ وہ جلدی سے جیپ اسٹارٹ کر کے چل پڑا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے دنیا گھوم سی رہی تھی، رگوں میں آگ سی دوڑ رہی تھی، سر پھٹا جا رہا تھا۔ سائٹ پر دیوہیکل ڈرل مشینیں اسی طرح کام کئے جا رہی تھیں۔ ماہر نے جیپ روکی، تیزی سے اترا پاگلوں کی طرح اس یورپین ایکسپرٹ کو ڈھونڈنے لگا جو ڈرل مشینوں کا انچارج تھا۔

اس کی آنکھیں دہک رہی تھیں۔ ماہر نے ایک کام کرنے والے سے پوچھا ''سعد! وہ ایکسپرٹ کہاں ہے؟''

''وہ اپنے خیمے میں ہے ماہر صاحب، یہ بریک کا وقت ہے۔''

ماہر نے پاگلوں کی طرح گالی دی۔
''جہنم میں جائے بریک! ہم بہت خطرے میں ہیں.....ان سے کہو کہ فوراً ڈرل مشینیں روک دیں۔ یہ علاقہ سخت چٹانوں کا ہے اور ڈرل کرنے سے دھماکا ہوسکتا ہے۔''
امریکن انجینئر نے سرد مہری سے کہا،
''ہم ایکسپرٹ کی اجازت کے بغیر مشینیں نہیں روک سکتے۔''
''ایکسپرٹ؟ کہاں ہے ایکسپرٹ'' وہ پاگلوں کے طرح بڑبڑا رہا تھا۔'' خدا غارت کرے اس ایکسپرٹ کو۔''

وہ دوڑا اور جیپ اسٹارٹ کر کے ایکسپرٹ کے خیمے کی طرف چلا۔ پھر ایک دم ہر چیز بھیانک قیامت کے منظر میں بدل گئی۔ ڈرل مشینیں دھماکے سے پھٹ گئیں۔ پہاڑیوں میں دھماکے گونج گئے۔ دہکتے ہوئے لوہے کے سرخ ٹکڑے ہر طرف بکھر گئے، آگ کے شعلے لپکنے لگے جیسے شیطان اپنی فتح کا جشن منا رہا ہو۔ زمین جگہ جگہ سے شق ہوگئی۔ کام کرنے والوں کا خون ریت میں جذب ہوگیا۔ ماہر بھی ان میں سے ایک تھا۔ گرم سورج کے تلے اس نے اپنے خون سے لکھا، '' الوداع میری جان! الوداع، صحیٰ۔''

ایک اور دل خون ہو رہا تھا، صحیٰ کے دل پر گہرا زخم لگا تھا۔ وہ بار بار کہہ رہی تھی ''ماہر تم اپنے ساتھ مجھے کیوں نہیں لے گئے۔''

درد و غم میں ڈوبے شب و روز گذرتے گئے، گھر کی ہر چھوٹی بڑی چیز ماہر کی یاد دلاتی رہی۔ یادوں کے خنجر اس کے دل میں اترتے رہے...... یہ وہ گلدان ہے جس میں ماہر نے گھر سے رخصت ہونے سے پہلے پھول سجائے تھے۔ سوکھے ہوئے پھول ان مہربان ہاتھوں کا لمس یاد کر رہے تھے۔ گھر کا صوفہ بھی ان دونوں کی مسرتوں کا گواہ تھا، کتنی بار دونوں ساتھ بیٹھ کر آرام سے باتیں کیا کرتے تھے.... ماہر کا دانتوں کا برش، بنیان، سینڈل، تکیہ، عطر کی

آدھی بھری ہوئی شیشی، سب اس کے منتظر تھے کہ وہ کب تپتے ہوئے صحرا سے واپس آئے گا۔ وہ چھوٹی سی سونے کی انگوٹھی بھی جان لیوا یادوں میں شامل ہوگئی تھی جو ان لوگوں نے اس کی لاش ملنے پر اسکی انگلی سے نکال کر بھیج دی تھی...... ہر ہر چیز رو رہی تھی، بین کر رہی تھی، چلا رہی تھی، ان دونوں کی اٹوٹ محبت کی کہانی دہرا رہی تھی۔

یوں ہی بے رنگ دن گذرتے گئے، زندگی کا نقشہ بدلتا گیا، پرانی یادیں دھندلاتی گئیں۔ اب ہر شے چلا چلا کر اپنی کہانی نہیں سناتی تھی بلکہ خاموشیاں یہ کہانیاں دہراتی تھیں۔ ماہر کا تکیہ جو ہر رات صحیٰ کے آنسوؤں سے بھیگا رہتا تھا، اب خشک ہوگیا تھا۔ اسکی کرسی کی جگہ دوسری کرسی آگئی۔ وہ گلدان ایک دن گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ اسکے پرانے کپڑے اٹھا کر رکھ دئے گئے۔ دل کا گہرا گھاؤ اب یادوں کا ایک ڈھیر بن گیا تھا جس پر وقت کی گرد جمتی جاتی تھی۔

زندگی گذرتی رہی۔ صُحیٰ نے ایک بار پھر محبت کی، ایک شوہر اور ایک گھر کا سکھ پایا۔ نئے شوہر کی چیزیں اسکی زندگی کا حصہ بنتی گئیں۔ اسکی آنکھوں میں نئی محبت کی چمک نے ماہر کی تصویر کی جگہ لے لی۔

ایک دن جب وہ اور فرید صحرا میں پکنک کرنے جا رہے تھے تو ایک جگہ ان کی گاڑی خراب ہوگئی۔ وہاں لوہے کے ٹکڑے دور دور تک تپتے ہوئے صحرا میں بکھرے ہوئے تھے۔ صحیٰ نے چاروں طرف دیکھا، دور تک بے جان صحرا پھیلا ہو اتھا۔ اسنے اپنے شوہر سے پوچھا۔

''یہ کون سی جگہ ہے؟ ایسا لگتا ہے کہ جیسے یہاں کبھی آگ لگی تھی۔ کالی راکھ جیسی ریت پر جمی ہے۔''

فرید جو کار ٹھیک کرنے میں مصروف تھا، اس نے سرسری انداز میں کہا

''میری جان، یہ ان مشینوں کا ملبہ ہے جو بہت سال پہلے پھٹ گئی تھیں، جب یہاں تیل کی تلاش کی جارہی تھی۔''

صحیٰ نے خود سے سرگوشی کی ''ماہر!'' ایک مہربان آنسو اسکے رخسار پر بھٹکنے لگا، مگراس نے وہ بڑا اسا سرخ زخم نہیں دیکھا جو ماہر کے خون نے زمین کے سینے پر لکھا تھا ''الوداع، میری جان! الوداع صحیٰ۔''

☆☆☆

چوتھا حصّہ

برُقان کی روح

نورہ الغامدی

''ساتھیوں! یہاں سے ہم لوگ وہ راستہ لیں گے جو سوکھے ہوئے کنویں کے پاس سے جاتا ہے۔ وہ راستہ چھوٹا ہے اور بہتر ہے۔''

''تمہارے خیال میں کیا ہم لوگ آج رات اپنا کام ختم کر لیں گے؟''

''چاہو تو ہمارے ساتھ آؤ یا واپس چلے جاؤ، جو جی چاہے کرو!'' ایک جھلائی ہوئی آواز نے جواب دیا۔

''مہربانی کر کے مجھے غلط مت سمجھو۔ تمھیں تو پتہ ہے یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔''

''مجھے معلوم ہے، مگر کیا تم یہ سب تباہی نہیں دیکھ رہے ہو؟''

''کیا تم کو یقین ہے کہ یہ اسی کا کام ہے؟''

''اور کون ہے؟ دیکھو کھجور کے باغ میں سارے پیڑ کیسے زمین پر گرے پڑے ہیں۔ کھیتوں میں وہ گڑھے اور کچی نالیاں دیکھو جن سے پانی بہہ بہہ کر صحرا میں چلا جا رہا ہے۔ تالاب کو دیکھو جس کا پانی روز رات کو ریت اور مٹی سے کثیف ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ پانی کے پمپ بھی خراب ہو گئے ہیں حالانکہ ان پر تو سیمنٹ کے ڈھکن ہیں۔ تم یہ سب دیکھ رہے ہو؟''

کھجور کی ٹہنیوں کے بیچ سے ایک الو تیزی سے اپنے پر پھڑپھڑا کر گھاس کے گٹھے کے پیچھے سے اڑا۔ جس کی آواز سے سوتی ہوئی چڑیاں بھی جاگ گئیں۔ قبرستان میں خشک کنویں کے پاس ٹیلے کی طرف ایک سرسراہٹ اور آواز سی ہوئی اور

کھجور کے باغ کی باڑھ کی طرف بڑھی جو گھاس کے گٹھر کے پیچھے چھپے ہوئے آدمیوں کو صاف سنائی دے رہی تھی۔ یہ ہی آواز روز رات کو سنائی دیتی ہے، کراہنے کی آواز جو کبھی آہوں میں بدل جاتی تھی، اور خشک کنویں کے پاس پہنچ کر، وحشت بھری گھٹی گھٹی چیخوں میں تبدیل ہو جاتی تھی۔ ہر رات ان چیخوں کے ساتھ کنویں کی دیوار مزید ڈھے جاتی، اس میں پتھر گرنے لگتے اور ایک بدبو ہر طرف پھیل جاتی۔

احمد نے جوان سب لوگوں میں سب سے کم عمر تھا، اپنی پگڑی کے سرے سے ناک ڈھکتے ہوئے سرگوشی کی'' گاؤں کے مولوی ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔ کل رات انھوں نے بتایا کہ انھوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اس کے بارے میں بتاتے ہوئے ان کا چہرہ پسینے سے بھیگ گیا تھا، آواز گھٹی گھٹی سی تھی۔ انھوں نے بتایا تھا کہ بھیڑیں ڈر کر اپنے باڑے سے باہر بھاگ نکلی ہیں، رکھوالی کرنے والے کتے جتنے بھی باقی بچے ہیں رات کو اس آواز کو سن کر زور زور سے بھونکنے لگتے ہیں۔ یہ کوئی بد روح ہے جو گاؤں کو ڈرا رہی ہے۔''

''ہو سکتا ہے کہ کوئی جنگلی جانور رہی ہو؟'' اثمار نے رائے دی۔

''مگر مولوی نے کہا تھا کہ وہ کوئی بد روح ہی ہے۔'' احمد نے اپنی بات جاری رکھی'' اور میں بھی یہ ہی کہتا ہوں کہ یہ کوئی بد روح ہے۔ کوئی جانور چاہے کتنا بھی بڑا کیوں نہ ہو وہ یہ سب نہیں کر سکتا جو یہ کرتی ہے۔ تم نے تسبیح کی دکان کا احاطہ نہیں دیکھا؟ جس کی کھڑکی ٹوٹ گئی تھی۔ اس بے چارے کو اپنے کچھ سامان سے بھی ہاتھ دھونا پڑا تھا۔ اور پھر وہ بدبو اور وہ دھول؟''

پیڑ سے کچھ کھجوریں ٹپک کر گھاس کے گٹھے کے پاس ان لوگوں کے پیروں کے پاس گر گئیں۔ احمد نے کچھ کھجوریں اٹھا لیں اور زور زور سے چبانے لگا۔

''میں سوچ رہا ہوں کہ اب وہ کہاں ہوں گے؟'' عجوز بدبدایا۔

''کون؟'' اثمار نے پوچھا۔

''میرے بیوی بچے۔ دو دن ہوئے وہ گاؤں چھوڑ کر چلے گئے۔ وہ کہہ رہی

تھی کہ وہ اس بدروحوں سے بھرے گاؤں میں نہیں رہ سکتی۔اب میں بالکل اکیلا رہ گیا ہوں۔''

اس کے دوست نے ہنستے ہوئے کہا۔''صرف تمہاری بیوی ؟ یہاں سے تو بہت سے لوگ بھاگ گئے ہیں۔تھوڑا پانی پیو!تمہارے گھر والے بھی جلد ہی واپس آجائیں گے۔''

''ذرا پانی دینا۔اف! کتنی بدبو ہے، مجھے تو الٹی آئی جارہی ہے۔یہ صرف کنویں کی بدبو نہیں ہے، مری ہوئی بھیڑوں کی بدبو بھی ہے۔ بہت سی بھیڑوں کو بھی عجیب عجیب بیماریاں ہوگئیں، کچھ اچانک مر گئیں۔وادی کی ساری فصلیں، غلّہ سب تباہ ہوگیا۔''اس نے اداسی سے کہا۔

''ہم سب کو معلوم ہے کیا ہو رہا ہے۔چلو پانی پیو'' اثمار نے کہا اور اپنا بازو احمد کے آگے کر دیا'' ذرا اس کی مالش کردو، درد ہو رہا ہے۔''

''کیا ہوا؟''

''مولانا صاحب کے خچر کے پیر کی پٹی کررہا تھا اس کے پاؤں میں زبردست موچ آگئی تھی۔اچھا خاصہ بڑا جانور ہے، بڑی مشکل سے قابو میں آیا۔'' پھر وہ دھیمی آواز میں بولا'' آج رات ہوا سرد ہے۔ہاں..... ہاں....''

چند لمحوں کے لئے خاموشی چھا گئی، صرف کھیت کے چاروں طرف لگے تمارسک (خودرو جھاڑی) کی جھاڑیوں میں ہوا سرسراتی رہی۔یہ مانوس سرسراہٹ گاؤں والوں کو کبھی جذباتی بنادیا کرتی ہے اور کبھی بے کل کر دیتی ہے۔خاص کر جب یہ کھجوروں کے درختوں پر پھل آنے کے موسم میں کسی بادوباراں کی خبر لے کر آتی ہے۔

''کیا تمھیں یقین ہے'' اثمار نے کہا'' جو کچھ اس نابینا بوڑھی عورت نے کہا ہے؟'' اس نے بہت رازداری سے کہا جیسے وہ خوفزدہ ہو۔''خاموش!'' رات کے سناٹے میں کراہنے کی آواز پھر آنے لگی۔اس بار یہ قبرستان کی طرف سے آرہی تھی۔ کاش!اگر گاؤں قبرستان سے کہیں دور جاسکتا۔

وہ سوال پھر دہرایا گیا "نابینا بڑھیا نے جو بتایا کیا وہ سچ ہے؟"
"اگر ہمیں یقین نہ ہوتا تو کیا آج رات یہاں آتے؟"
نابینا بڑھیا نے اپنی چھڑی سے چھو کر ہر اس جگہ کی نشاندہی کی تھی جہاں بدروح کے قدم پڑے تھے۔ "ہر رات وہ بدروح آتی ہے۔" اس نے کہا تھا۔ "میں اس کی آواز پہچانتی ہوں"۔
مگر کوئی مرا ہوا آدمی زندہ کیسے ہوسکتا ہے۔ اسے مرے ہوئے تو پانچ مہینے ہو گئے۔ مگر مولانا صاحب سے وہ بڑھیا اسی بات پر اصرار کرتی رہی کہ یہ بُرقان کی روح ہے جو رات کو گاؤں اور کھیتوں میں پھرتی ہے۔ مولانا صاحب کچھ لوگوں کے ساتھ قبرستان گئے تو دیکھا کہ بُرقان کی قبر کی مٹی ایک طرف سے اپنی جگہ سے ہٹی ہوئی ہے۔
عجوز نے کہا "بُرقان کی روح کو جب تک چین نہیں آئے گا جب تک اس سے پوچھا نہ جائے کہ وہ کیا چاہتا ہے۔"
وہ تینوں سوکھی نہر کے راستے مقررہ جگہ پہنچنے کے لئے آگے بڑھنے لگے۔ قبرستان اور گھاس کے گٹھے پیچھے رہ گئے۔
"یا اللہ! اس پرانی نہر نے بھی اپنا راستہ بدل لیا ہے۔" اثمار نے اپنی آستین سے پسینہ پوچھتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو بیچارے بُرقان کے خیال سے ہی پسینہ آرہا ہے حالانکہ ہوا تو کافی ٹھنڈی ہے۔" وہ سوکھے پتوں اور کانٹوں سے بچتا ہوا آگے آگے چل رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر میں ساتھی اسے خبردار کرتے جارہے تھے۔
"سنبھل کر۔ سامنے ایک خاردار جھاڑی ہے......گڈھے سے بچنا......"
اس پر خطر وقت میں بھی اسے اپنی بیٹی کا خیال آرہا تھا۔ کئی دن پہلے بیٹی کے کراہنے کی آواز سے اس کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ اس کو لقوہ مار گیا ہے۔
جب اچانک اثمار کو ایک پتھر سے ٹھوکر لگی جو چکنی ریت سے ڈھکا ہوا تھا تو کراہنے کی آواز پھر سے آئی جو بالکل صاف تھی۔ آسمان میں دھول کے بادل اڑے اور خشک ٹہنیوں میں پھر سے کھڑکھڑاہٹ ہوئی۔

عجوز نے پوچھا'' کیا تسبیح فروش کو آنے میں دیر لگے گی؟''

احمد نے کہا'' وہ شاید راستے میں ہی ہوگا۔''

وہ ایک پر پیچ سڑک پر مڑ گئے جس کے دونوں طرف درخت اور کھنڈر تھے۔ یہ راستہ اس نئی مسجد کی طرف جاتا تھا جو گاؤں والے تعمیر کر رہے تھے۔ جو اس راہ پر آنے والوں کیلئے دور سے چراغ راہ کا کام کرتی تھی۔ رات کی خاموشی میں سارا گاؤں سو رہا تھا، ایک جیسے کچی اینٹوں کے مکانات تھے، ایک منزلہ پکے لکڑی کی چھت والے مکان جو کھجور، تمارسک، اور عرعر کی لکڑی کی باڑھ سے گھرے ہوئے تھے۔

'' یہیں رک جاؤ! یہ ہی جگہ ہے۔'' اثمار نے کہا۔ وہ اس مقررہ جگہ پہنچے جہاں چوتھے آدمی کو ملنا تھا۔

وہ شخص، تسبیح فروش، ابھی راستے میں تھا، اس نے اپنے کندھے پر پڑی جائے نماز اور رومال کو چھوا۔ وہ پانی کے پمپوں کی طرف مڑ گیا اور اپنا سر ہلایا۔ رات کی خاموشی میں پمپ بھی ساکت تھے۔ اسے وہ کہانیاں یاد تھیں جو گاؤں میں عام تھیں کہ بُرقان نے اپنے بہت سے پڑوسیوں کے ہاں چوری کی تھی۔ اسکی بے گناہی کا ثبوت بس وہ اسکی گواہی تھی جو اس نے مولانا صاحب کی موجودگی میں دی تھی۔ بُرقان نے ہاتھ اُٹھا کر قسم کھائی تھی'' اس آدمی کے کھیت کی مینڈھ نہیں توڑی گئی ہے۔ اسکے کھیتوں کہ حدیں بالکل ویسی ہی ہیں جیسی اس نے اپنے باپ دادا سے ورثے میں پائی تھیں۔''

ہر شخص کو پتہ تھا کہ جب وہ کسان صبح اٹھتا تھا تو دیکھتا تھا کہ کوئی کھجور کا پیڑ یا کچھ زمین اس چالاک بُرقان نے ہتھیا لی ہے۔ نابینا بڑھیا کی ایک چوتھائی زمین بھی بُرقان نے ہڑپ کر لی تھی۔ وہ کھیت کے درمیان مینڈھ کو توڑ کر بدل دیتا تھا۔ یہ مینڈھ کھجور کی خشک ٹہنیوں اور تمارسک کو رسیوں سے باندھ کر بنائی جاتی تھی۔ مغرب اور فجر کے دوران بُرقان کھیت کی مینڈھ کو توڑ کر چوتھائی میٹر کھسکا کر دوبارہ باندھ دیتا تھا۔ پھر ایک مہینے بعد پھر اسی طرح اور کچھ حصہ ہڑپ کر لیتا۔

تسبیح فروش نے جھک کر اپنے ٹھیٹھ پڑے ہوئے پاؤں سے کانٹا نکالا۔ وہ

ان گاؤں والوں کے بارے میں سوچنے لگا جونئی پکی مسجد اور کھیتوں کے درمیان اس نئے راستے پر پرانے خشک کنویں کے قریب سے گذرتے ہیں جس سے رات کو ڈھول کے جھکڑ نکلتے ہیں۔ وہاں سے گذرتے ہوئے لوگ اپنی خشک انگلیوں میں تھامی تسبیح پڑھتے رہتے ہیں۔ یہ کنواں گاؤں والوں کا خفیہ کوڑا گھر تھا۔ کئی سال پہلے ایک افواہ پھیلی تھی کہ اس کنویں میں ایک نوزائیدہ بچے کی لاش پڑی ملی تھی۔ جس کے بعد گاؤں کے مردوں نے زور ڈالا تھا کہ گاؤں کی لڑکیوں کی شادی بارہ تیرہ سال کی عمر سے پہلے ہی کر دی جائے۔ تسبیح فروش نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اسکی اپنی بیٹی اس افواہ کی وجہ سے، چودہ سال کی عمر میں اپنی پہلی زچگی کے دوران مر گئی تھی۔

اس نے دیکھا کہ کنویں سے دھول اٹھ رہی تھی، کراہنے کی آواز بڑھ گئی تھی، تیز بد بو آ رہی تھی۔ اس نے اپنی ثوب کا دامن دانتوں میں دبا لیا تا کہ جتنا تیز دوڑ سکتا ہے دوڑ لے۔ اس ٹیلے کے کنارے پر جو قبرستان اور وادی کی حد بندی کرتا تھا، اسکے پاؤں سوکھی ہوئی گھاس میں دھنس گئے۔ ''یا اللہ! یا اللہ! ہمیں تباہی سے بچا!'' اپنے تینوں ساتھیوں کے پاس وہ چلاتا ہوا پہنچا۔

''آخر تم آ ہی گئے'' ان میں سے ایک نے اسے چھیڑا ''ہم سمجھے تم ڈر کے مارے گھر میں ہی رک گئے''

''نہیں نہیں، میں بُرقان کی بیوی کے گھر کے پاس سے گذرا تو پتہ چلا کہ آج رات اس کے ہاں بچہ پیدا ہوا ہے۔''

''شکر اللہ! اللہ مبارک کرے''

''اب اس بچے سے بُرقان کی بے چاری بیوہ کا دل بہل جائے گا۔'' ان لوگوں نے کہا۔

''وہ بوڑھی عورت اس کے پاس ہے۔ بیوہ رو رہی تھی اور التجا کر رہی تھی کہ جو کچھ بوڑھی عورت نے کہا ہے وہ ہی کرو۔ اور سب سے حیران کن بات یہ ہے کہ پیدا ہوتے ہی جب بچہ رویا تو اس بدروح کی بھیانک آواز نے جواب دیا۔ بے چاری بیوہ کہے جا رہی تھی

''اس نے پڑوسی کی چند میٹر زمین ہڑپ کر لی تھی۔ بوڑھی عورت کے کھیت کی مینڈھ بھی دوبار توڑ کر بدلی تھی۔''

یہ وہ ہی مینڈھ تھی جو اس نہر کے پاس سے شروع ہوتی تھی، وہ ہی نہر جس نے اپنا راستہ بدل لیا تھا جب بُرقان اپنی قبر سے نکل آیا تھا۔

''اب وہ روز کھدائی کرتا ہے کچھ کرنا چاہتا ہے۔''

''ہمیں اس بات کا پتہ چلانا ہوگا کہ وہ کیا کر رہا ہے اور کیا چاہتا ہے۔''

''اور وہ جھونپڑی ہے نا جو برقان کے کھیت کو اسکے ایک بدوّ پڑوسی کے کھیت سے الگ کرتی ہے، وہ بھی بُرقان کی نہیں ہے۔ یہ اس بدوّ کی ہے جو ہر موسم خزاں میں آتا تھا''۔

''مجھے یاد ہے کہ کیسے جلدی جلدی برقان نے ایک چوڑی سی، اونچی چھت والی جھونپڑی کھڑی کر لی تھی۔'' ان میں سے ایک نے کہا۔

''اس نے پڑوسی کی چوتھائی سے زیادہ کھجور کی ٹہنیاں بھی استعمال کر لیں تھیں، ہرے بھرے کھجوروں کے پیڑوں کے تنے اکھاڑ لئے تھے، دس تمارسک کی جھاڑیاں اکھاڑ لی تھیں جو اسکے گھر کے چاروں طرف لگی تھیں۔ اور پانچ آدمیوں کو کھجور کے ریشوں کی رسی بٹنے پر لگا دیا تھا۔ اور یہ بات بھی عجیب ہی تھی کہ جب وہ بدوّ آیا تو وہ بُرقان کی ان حرکتوں پر خاموش ہی رہا، بس اتنی دعا کی،

''یا اللہ، ہماری دولت ہمیں لوٹا دے اگر وہ واقعی ہماری ہی ہے تو۔''

بدروح پھر سے کھجور کے پیڑوں سے ٹکرا رہی تھی۔ بُرقان جب زندہ تھا تو رات کو بے خبر سویا کرتا تھا۔ صبح کو اسکے نوکر دوڑ دوڑ کر، تھوڑے سے کھانے کے عوض، اسکے احکام بجالاتے تھے۔ کسی نے نہیں سوچا تھا کہ اس کا انجام اتنا بھیانک ہوگا۔

''میرے بچے خوفزدہ ہیں، جب تک میرے اور اپنی ماں کے بیچ نہ لیٹے ہوں انھیں نیند نہیں آتی۔'' ایک نے کہا۔

''صرف تمہارے بچوں ہی کے ساتھ یہ نہیں ہو رہا ہے۔'' اثمار نے کہا،

''گاؤں کا چوراہا ویران پڑا ہے۔ دروازے بند ہیں، گلی میں بچوں کی ہنسی کی

آوازیں نہیں آتیں۔ بچے جب کھانا کھانے میں آنا کانی کرتے ہیں تو لوگ انھیں بد روح سے ڈراتے ہیں۔ میرے پڑوسی کے بچے، جو ہمیشہ مشکل سے کھانا کھاتے تھے، اپنے ماں باپ کو پریشان رکھتے تھے، اس ڈر سے پیٹو ہو گئے ہیں۔''

''یہ سب مصیبتیں میری بیٹی کے اپاہج ہونے کے مقابلے کچھ بھی نہیں ہیں۔'' اثمار نے کہا۔

تسبیح فروش ان لوگوں کے بیچ میں کھڑا، دعائیں پڑھ رہا تھا، مولانا صاحب کا پڑھا ہوا پانی پی رہا تھا۔ پھر وہ ایک ایک کر کے اپنے کپڑے اتارنے لگا۔

''وہ خاص جڑی بوٹیاں کہاں ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

احمد نے آگے بڑھ کر اسکے ننگے، سانولے بدن پر ایک خاص قسم کی پتیاں ملیں اور مولانا صاحب کا پڑھا ہوا پانی چھڑکا۔ اسکے بعد صندل کے تیل، عنبر اور عرقِ گلاب کا آمیزہ اس کے جسم پر پوتا۔ یہ سب چیزیں وہ بڑی مشکلیں اٹھا کر دور طائف سے لائے تھے۔

''تم ٹھیک ہونا؟'' احمد نے پوچھا۔

بوڑھی عورت نے تاکید کی تھی کہ وہ کوئی مضبوط دل کا آدمی ہونا چاہیے جو رات کو قبرستان میں جا کر مُردوں سے باتیں کرنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔

تسبیح فروش نے اپنا سفید رومال تہبند کیطرح باندھ لیا اور ہنستے ہوئے بولا،

''اگر میں یہ نہیں کروں گا تو بُرقان گاؤں میں گھومتا پھرے گا۔ اور اس کنویں کی تہہ سے وہی سڑاندھ آتی رہے گی۔ وہ بے چارہ مرا ہوا ہے۔ دعا کرو کہ اللہ میری مدد کرے۔ وہ چبانے والی لبان کہاں ہے۔ (ایک چیونگ گم جیسی چیز جو درختوں سے رسنے والے شیرے سے بنائی جاتی ہے۔)

اثمار نے اسکو لبان کا ایک بڑا سا ٹکڑا دیا۔ وہ اندھیرے میں قبرستان کی طرف چلے۔

کراہنے کی آواز، الو کا پھڑپھڑانا اور دھول کا اڑنا سب کچھ رک گیا تھا۔ وہ

لوگ قبرستان کے دروازے پر ہی رک گئے۔ تسبیح فروش نے الٹے قدم قبروں کی طرف چلنا شروع کر دیا۔

''دھیان سے! مڑ کر مت دیکھنا'' اثمار نے تاکید کی۔

وہ قدم بہ قدم قبروں کی طرف پشت کیے الٹا چلتا رہا۔ اک نئی غیر مانوس سی بو آنے لگی۔ اور قبر میں سے ایک زوردار چیخ بلند ہوئی، رات کے سناٹے کو چیرتی ہوئی ایک چیخ۔ وہ تینوں واپس پیچھے ہٹ گئے، انھوں نے سر جھکائے پھر اٹھائے، ان میں سے ایک پورا گھوم گیا۔ رات کی ٹھنڈی ہوا، غبار اور چیخ کی آواز ان کے چہروں پر تھپڑ سے مار رہی تھی۔ عجوز نے دیکھا کہ کوئی چیز گھاس پھونس پر رینگ رہی تھی۔ ''دیکھو! ایک بچھو ہے یہاں'' اس نے خبردار کیا۔

''شاید کوئی روح بچھو بن کر آ گئی ہے'' مگر فوراً ہی ڈنڈے سے اسے مار ڈالا گیا۔

ایک اور چیخ رات کے سناٹے میں گونجی، پھر ایک اور اس سے کچھ ہلکی، تیسری اور دھیمی، چوتھی اور پھر خاموشی چھا گئی۔

''ہمارے دوست کو اب تک قبر سے باہر آ جانا چاہئے تھا، اسے دیر ہو گئی۔ چلو ہم لوگ چلیں''۔

''رکو! وہ آ رہا ہے۔''

اور وہ سب چلانے لگے ''اللہ اکبر، اللہ اکبر!''

تسبیح فروش ان کے قدموں میں گر پڑا اور قے کرنی شروع کر دی۔

''تم نے اس سے بات کی؟''

''ہاں! ہاں! میں نے بُرقان سے بات کی۔ اس نے وہی ساری باتیں دہرائیں جو اس کی بیوی نے بتائی تھیں۔ وہ مجھ سے منتیں کر رہا تھا گڑگڑا رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا، مہربانی کر کے وہ سب زمین جو میں نے لوگوں کی ہڑپ کر لی تھی وہ ان کے اصل مالکوں کو واپس لوٹا دو۔ کھیتوں کی مینڈھوں کو اپنی اصلی جگہ واپس بنا دو۔ مہربانی

کر کے مجھے چین سے رہنے دو۔''

ان چاروں میں سے سب سے کم عمر آدمی اس پر جھک کر کہنے لگا ''بتاؤ وہ کیسا تھا؟''

''ارے بیوقوف! میں پیٹھ پھیرے اس سے بات کر رہا تھا۔ تم بھول رہے ہو کہ اگر میں اسکی طرف دیکھ کر بات کرتا تو وہ بول ہی نہیں سکتا تھا۔ مگر تم فکر مت کرو! بُرقان اب خاموش ہو گیا ہے۔ اس نے مجھے اپنا پیغام دے دیا ہے۔ کل صبح میں گاؤں والوں کو یہ سب بتادوں گا۔ چلو میرے ساتھ دوستوں، حیَّ یارفاق!''

''دوستوں چلو میرے ساتھ'' بُرقان کے گاؤں میں اور قریب کے دوسرے گاؤں میں ''حیَّ یارفاق'' اک عام جملہ تھا جو اس وقت بولا جاتا تھا جب کسی اہم کام کو انجام دینا ہوتا تھا۔

اور یہ اہم کام شروع ہو گیا۔ کھیتوں کی مینڈھیں درست کی گئیں۔ پتھر اور سمینٹ کی نہریں سینچائی۔ کے لئے بنائی گئیں۔ پانی اب بالکل صاف ہو گیا، کسی بھی راہگیر کی پیاس بجھانے کیلئے بالکل صاف ستھرا۔ راہگیروں کے ستانے کے لئے خوشبو دار پھولوں نے بھری ایک پہاڑی بن گئی۔ اگر کوئی راہگیر کھجوروں کے باغ کے درمیان اس خوشگوار جگہ کا راز پوچھتے ہیں تو بتایا جاتا کہ یہاں پر کسی زمانے میں ایک پرانا خشک کنواں ہوا کرتا تھا۔

آج جب کوئی مشرقی منطقے کے اس خوبصورت علاقے سے گذرتا ہے تو وہاں ایک خوش حال شہر اور بڑا سا ڈیم نظر آتا ہے۔ یہ شہر ایک لطیف سا تاثر دیتا ہے۔ اس شہر کو قرینے سے سجایا گیا ہے، یہاں سکون ہے، پھولوں کی بہتات ہے۔ یہاں کے شہری اپنے گھروں کے دروازے مہمانوں کے لئے کھلے رکھتے ہیں۔ لوگ گھروں سے پھول اور مشعلیں لیکر یہ کہتے ہوئے باہر نکل آتے ہیں،

''ساتھ آؤ دوستوں! حیَّ یارفاق۔''

☆☆☆

دیوانہ

جمیلہ فطانی

استاد سعید جو کہ ایک عالم تھے ان کے بارے میں وہ لوگوں کی باتیں سنا کرتی تھی۔

"وہ ہر بات جانتے ہیں۔"

"وہ علم کے ہر میدان کے ماہر ہیں۔"

"وہ مذہب، ادب، سیاست، طب، اور یہاں تک کہ علم نجوم میں بھی بہت کچھ جانتے ہیں۔"

وہ اور بہت سی سائنسی باتیں بھی جانتے تھے جس کے معنی بھی رقیہ نہیں جانتی تھی بلکہ ابھی تو وہ ان کو گن بھی نہیں سکتی تھی۔

رقیہ کو ان کے بولنے کا انداز بہت اچھا لگتا تھا۔ عجب وقار اور فصاحت تھی ان کے انداز میں۔ الفاظ کی روانی اور ہاتھوں کی مناسب حرکات مل کر اک موسیقی سی پیدا کرتی تھیں۔ وہ ہمیشہ کلاسیکل عربی بولا کرتے تھے، اکثر قرآن کی سورتیں پڑھتے تھے اور حدیثیں بیان کرتے تھے، اشعار پڑھتے تھے۔

وہ ایک پر وقار اور وجیہ آدمی تھے۔ اس علاقے کے لوگ انھیں ہمیشہ کتابیں لئے ہوئے ہی دیکھتے تھے۔ کم کتابیں ہوتیں تو ایک بازو میں سنبھالے ہوئے ہوتے اور اگر زیادہ ہوتیں تو سینے سے کتابوں کی ڈھیری لگائے دونوں ہاتھوں سے تھامے ہوئے ہوتے۔ ہر عمر کے لوگ ان کو راستے میں روک کر کسی موضوع یا مسئلے کے بارے میں سوال کرتے۔ وہ بہت خاکساری مگر اعتماد سے سوالوں کے جواب دیتے تھے۔ ان

کے جوابات سے ان کے وسیع علم کا اندازہ ہوتا تھا۔

رقیہ تو بہت چھوٹی سی تھی، صرف دس سال کی، پہاڑی کی چوٹی سے کافی نیچے اسکا گھر تھا۔ وہ وہاں سے بڑے شوق سے استاد سعید کو گذرتے دیکھا کرتی تھی۔ استاد سعید کا گھر پہاڑی کی چوٹی پر تھا۔ وہ اپنی دوستوں اور کھلونوں کو چھوڑ کر ان کے نپے تلے قدم، ان کے باتیں کرنے کا انداز اور لوگوں کی ان کے لئے عزت وتکریم دیکھا کرتی تھی۔ اس علاقے میں بس وہ ہی تھے جن کو سب استاد کہتے تھے۔

وہ سوچ رہی تھی استاد ہمیشہ کتابیں کیوں لئے رہتے ہیں۔ وہ انھیں کیوں پڑھتے ہیں؟ اور کسی کے پاس تو اتنی کتابیں نہیں ہیں۔ اور نہ ہی کوئی اور کتابوں کے ساتھ اتنا وقت گذارتا ہے کہ وہ اس کی ساتھی ہی بن جائیں۔ رقیہ کے دماغ میں بہت سے سوال گھوم رہے تھے۔

''استاد سعید!'' اس نے پکارا

انھوں نے اسکی طرف کھوئی کھوئی نگاہوں سے دیکھا۔ رقیہ کو ان کی آنکھوں میں اداسی جھانکتی نظر آئی۔ ان کی شخصیت میں کچھ ایسا تھا جو وہ سمجھ نہیں پائی۔ کیا یہ کتابیں ان کی اداسی کا راز ہیں؟ نہیں، ان کی اداسی کی وجہ یہ کتابیں نہیں ہوسکتیں، اس نے سوچا۔ وہ ہمیشہ کتابیں کیوں لئے رہتے ہیں؟ لوگ کہتے ہیں کہ وہ اپنے گھر والوں سے زیادہ کتابوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ وہ کتابوں کو بہت احتیاط سے رکھتے ہیں، انھیں فکر رہتی ہے کہ ذراسی دھول یا بارش کا کوئی قطرہ انھیں خراب نہ کردے۔ اس نے اکثر انھیں اپنی کتابیں لے کر چچا خمیس کی دکان میں جاتے دیکھا ہے جہاں وہ گھنٹوں بیٹھے پڑھتے رہتے ہیں، تھکتے بھی نہیں، اکتاتے بھی نہیں۔ جب وہ شیخ خضر کی بیٹھک میں علاقے کے لوگوں سے بات چیت کرنے کے لئے آبیٹھتے ہیں تو کچھ دیر بعد ایک طرف بیٹھ کر اپنی کتابیں پڑھنے لگتے ہیں یا جب تک لوگ اپنے گھروں کو چلے نہیں جاتے ان کو ایک کے بعد ایک اخبار پڑھ کر سناتے رہتے ہیں۔

''یا رقیہ!'' انھوں نے رقیہ سے کہا تھا'' کیا بات ہے میری بچی؟''

اس نے انھیں اوران کی کتابوں کی طرف دیکھااور پوچھا،

''لوگ آپ کو استاد سعید کیوں کہتے ہیں؟ کیا ہمارے علاقے میں آپ ہی ایک استاد ہیں؟ کیا اسی لئے کہ آپ یہ کتابیں پڑھتے ہیں؟ کیا ان کتابوں نے ہی آپ کو اتنا قابل آدمی بنایا ہے؟''

رقیہ کوان کی نگاہیں دیکھ کراندازہ ہوا کہ وہ کہیں اور ہی کھوئے ہوئے ہیں۔وہ سمجھ نہیں پارہی تھی کہ استاد اسکی بات کا جواب دیں گے یا شاید وہ غصہ ہو گئے ہیں۔جب وہ چچا خمیس کی دکان یا شیخ خضر کی بیٹھک میں بیٹھے ہوتے ہیں تو ان کی نگاہیں کھمبے پر ٹنگی لالٹیں پر جمی ہوتی تھیں۔ایسے ہی بہت سے کھمبے تو ان کے پہاڑ کی چوٹی پر بنے گھر کے راستے میں بھی لگے ہوئے تھے۔یا ان کی نگاہیں اس آدمی پر جمی رہتیں جو اپنے گدھے کو ہانکتا،سڑک سے اوران ٹوکریوں سے کوڑا اکٹھا کیا کرتا جو چھوٹے بچے اپنے گھروں کے باہر رکھ دیا کرتے تھے۔وہ آدمی دروازے کھٹکھٹا کر مخصوص آواز لگاتا ''بچوں،کوڑا!بچوں ،کوڑا''۔استاد سعید اس پر نظر جمائے رہتے اور پھر اپنی کتابوں میں کھو جاتے۔

''یا رقیہ!سنو......''

ان کی آواز رقیہ کوان کی عجیب سی دنیا کی تصویروں سے باہر لے آئی۔

''یہ کتابیں رقیہ، بہت بڑی چیز ہیں۔یہ مجھ پر کائنات کے راز کھولتی ہیں۔ یہ مجھے بہت سی باتیں بتاتی ہیں جو میں اپنے آپ نہیں جان سکتا۔تم سمجھ رہی ہو نا؟ ہاں،ہاں تم سمجھ رہی ہو،تم بہت ذہین ہو۔تم بھی ان کتابوں سے دوستی کرلو۔دل وجان سے ان کی ہو جاؤ،یادرکھو،انشااللہ تم ایک دن بہت قابل عورت بن جاؤ گی۔''

وہ بولتے رہے اور وہ سر ہلاتی رہی۔اسے لگا کہ کچھ باتیں اس کی سمجھ میں آرہی ہیں۔پھر وہ چل دئے اور رقیہ حیرت سے انھیں دیکھتی رہی۔

بعد میں اس نے لوگوں کو کہتے سنا،

''استاد سعید پاگل ہو گئے ہیں۔''

''وہ اپنے آپ سے باتیں کرتے رہتے ہیں۔''

''وہ عجیب بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں۔''

''یہ کتابیں جو وہ پڑھتے رہتے ہیں ان ہی کی وجہ سے ان کا دماغ چل گیا ہے۔''

لوگ ان سے بات کرنے سے کترانے لگے اور بعد میں ان سے ملنے سے بھی بچنے لگے۔ ایک دن جب رقیہ نے بہت شوق سے ان کو پکارا ''استاد سعید!''

اس کی ایک سہیلی اسے گھسیٹ کر ایک طرف لے گئی اور کان میں کہا ''تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ تم پاگل آدمی سے بات کرو گی؟ تم کو ڈر نہیں لگتا کہ کہیں وہ تمھیں مارنے نہ لگے یا جان سے ہی مار ڈالے؟''

''میں نہیں مان سکتی، استاد سعید پاگل نہیں ہیں، ہو ہی نہیں سکتے۔ یہ کتابیں ان کی دوست ہیں، دشمن نہیں جو ان کا دماغ ہی لے جائیں۔ لوگ ایسا کیسے کہہ سکتے ہیں؟ لوگ بس ان سے جلتے ہوئے ہیں کیونکہ ان سب کے بیچ وہ ہی تو ایک استاد ہیں، قابل آدمی ہیں۔''

مگر استاد سعید نے رقیہ کے سلام کا جواب نہیں دیا۔ بس رک کر ایک لمحہ اسے دیکھا۔ وہ حیران سی انھیں دیکھتی رہی اور بڑبڑاتی رہی،

''نہیں، نہیں، یہ پاگل نہیں ہو سکتے، نہیں!''

پھر بچے ان کے پاس سے ''پاگل! پاگل!'' کہہ کر بھاگنے لگے۔ پھر اس نے ایک دن دیکھا کہ استاد رُک گئے، اپنی کتابیں زمین پر رکھ دیں اور بچوں کو پتھر مارنے لگے۔ چند بچوں نے ان پر پتھر اور خالی ڈبے پھینکنے شروع کر دیئے، پھر اور بھی بچے ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ ایک خوف کی لہر رقیہ کے جسم میں پھیل گئی۔ وہ بے ارادہ ہی چلانے لگی۔ ''پاگل! پاگل!''

استاد سے اس کی نگاہیں ملیں تو وہ سیدھی گھر کی طرف بھاگی مگر راستے میں ٹھوکر لگی، استاد نے اس پر ایک پتھر پھینکا۔ وہ دوڑتی ہوئی گھر میں گھس گئی اور دروازہ بند کر لیا۔ سر میں تکلیف محسوس ہوئی، ہاتھ سے چھو کر دیکھا تو خون بہہ رہا تھا۔ وہ دہشت زدہ سی رہ گئی۔

''کیا ہوا؟'' اسکی ماں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''میں گر گئی تھی، ایک بڑے پتھر سے ٹھوکر لگی تو چوٹ لگ گئی۔'' اس نے بس

اتنا ہی کہا۔ اسے خود پتہ نہیں کہ اس نے یہ جھوٹ کیوں بولا۔

بہت زور کی بارش ہونے لگی۔ سارا قریہ بارش میں ساکت تھا۔ سب دکانوں کے لکڑی اور لوہے کے دروازے بند ہو گئے۔

رقیہ نے انھیں پہاڑی سے اترتے دیکھا۔ وہ بارش کی خوشبو، سکوت اور اداسی اپنے سانسوں میں بھر رہے تھے۔ رقیہ کے قدم خود بخود باہر کی طرف اٹھ گئے۔ آسمان دن کے آخری لمحوں کو الوداع کہہ رہا تھا۔ رات کی سیاہی کی لکیریں دھنک کے رنگوں میں شامل ہو رہی تھیں، اور ہوا بارش کی خوشبو لئے ہوئے تھی۔

سردی سے اس کو جھرجھری سی آ گئی۔ وہ جلدی میں اپنا کوٹ بھی نہیں پہن پائی تھی کیونکہ اسے ڈر تھا کہ کہیں استاد نکل نہ جائیں۔ اس کے سر میں اب بھی تکلیف تھی مگر اس نے کوئی پرواہ نہ کی اور اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔

دو مضبوط ہاتھوں نے اسے دونوں کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔

''رقیہ تم بھی مجھے پاگل کہتی ہو، تم بھی؟ کیا میں پاگل ہوں؟''

وہ ڈر گئی۔ کیا ان کی دہکتی ہوئی آنکھوں میں پاگل پن تھا؟ یا ایک زخمی آدمی کے انتقام کی چمک تھی؟ وہ سانس روکے ان کے چہرے کو غور سے دیکھتی رہی۔

''ہاں... نہیں، کبھی نہیں...... کبھی نہیں'' وہ بدبدائی۔ وہ بھاگ جانا چاہتی تھی مگر ایسا لگتا تھا کہ زمین نے اس کے پاؤں پکڑ لئے ہوں۔

استاد سعید نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اسکے کندھوں سے اپنے ہاتھ ہٹا لئے۔ رقیہ نے ان کے چہرے پر آنسو بہتے دیکھے۔ جب انھوں نے آنکھیں کھولیں تو ان میں نہ نفرت تھی اور نہ ہی پاگل پن تھا، بس اداسی تھی۔

''نہیں استاد سعید!'' اس نے کہا ''قسم اللہ کی آپ پاگل نہیں ہیں، پاگل نہیں ہیں۔ جو آپ کو پاگل کہتے ہیں وہ خود پاگل ہیں، آپ نہیں۔''

''تم میرے ڈر کے مارے یہ بات کہہ رہی ہو؟''

''نہیں، اللہ کی قسم نہیں۔ میں آپ سے خوفزدہ نہیں ہوں۔ نہیں تو میں اس

طرح اکیلی آپ سے ملنے کیوں آتی ؟ میں تو اس لئے باہر آئی تھی کہ آپ سے معافی مانگ سکوں۔ استاد! مجھے معاف کر دیجئے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ مجھے کیوں ستاتے ہیں، میں نے ان سب کو صرف محبت دی ہے، کسی کو کبھی پریشان نہیں کیا۔ وہ مجھے پاگل کیوں کہتے ہیں؟"

"یہ لوگ آپ سے حسد کرتے ہیں اس لئے آپ سے چڑتے ہیں کیونکہ آپ بہت قابل آدمی ہیں اور یہ لوگ آپ کی طرح سوچ نہیں سکتے، بول نہیں سکتے، پڑھ نہیں سکتے!"

انھوں نے سر ہلایا۔ "کیا تم یہ سب باتیں میری بیوی کو اور اس علاقے کے لوگوں کو بتا سکتی ہو؟" ان کی آنسو بھری آنکھوں میں مسکراہٹ چمکنے لگی۔ انھوں نے کہا،

"بس تم ہی ہو جو سمجھتی ہو کہ میں پاگل نہیں ہوں.... مگر یہ لوگ تمہاری بات نہ سنیں گے نہ یقین کریں گے۔ رقیہ جب تم بڑی ہو جاؤ تو تب تم میری کہانی لکھنا۔ میری کہانی لکھنا نہ بھولنا۔ میں اسے پڑھوں گا انشا اللہ! میں اسے دوسری دنیا میں پڑھوں گا۔"

ان کے یہ آخری الفاظ خاموشی میں جذب ہو گئے۔ انھوں نے رقیہ کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھا "الوداع!" اور آہستہ آہستہ قدم رکھتے، کتابوں کا بوجھ سنبھالے استاد سعید اندھیرے کی آغوش میں گم ہو گئے۔

دوسرے دن صبح قریے کے لوگ سرگوشیاں کر رہے تھے۔ "وہ پاگل آدمی کہیں چلا گیا۔ کل رات وہ اپنے گھر میں نہیں سویا۔ اپنی زیادہ تر کتابیں ساتھ لے کر چلا گیا۔"

وہ اپنی بیوی کے لئے ایک پرچہ چھوڑ گئے تھے جس کو قریے کے ایک پڑھے لکھے آدمی نے ان کی بیوی اور دوسرے لوگوں کو پڑھ کر سنایا۔

"میں ایسے دل کی تلاش میں جا رہا ہیں جو محبت سے بھرا ہو اور خیال و احساس کے لئے کشادہ اور کھلا ہوا ہو۔"

ان کی بیوی منہ کھولے سنتی رہی پھر وہ، اور باقی سب لوگ کہنے لگے "اونہہ وہ تو پاگل ہے۔"

☆☆☆

ایک ہزار چوٹیاں اور ایک انا

رجاء علیم

(اس کہانی میں روایتی کہانیاں، عربین نائٹس، اور پرانے قصے روز و شب کی حقیقتوں کے ساتھ مل کر، راوی کے شعور اور خود آگہی کو فزوں تر کرتے ہیں۔ ایڈیٹر)

جب میرے بال لمبے اور چمکدار ہوتے گئے تو میرے والد قہرامانہ نامی ایک نئی انا کو میرے لئے گھر میں لے آئے۔

جب انا نے میری چوٹیاں چھوئیں اور ان میں چھپے سارے اسرار دیکھ لئے۔ اس نے میرے سر میں سنہرا تیل لگایا، میرے سر میں ہزاروں مخلوقات گنگناتی رہیں۔ میں نے نظر اٹھا کر قہرامانہ کی طرف دیکھا جو پراسرار انداز میں مسکرا رہی تھی۔ جیسے اس نے سب کچھ سن لیا تھا اور جانتی تھی کہ کیا ہونے والا ہے۔ وہ مسرور تھی اور میرے بالوں کی لٹیں میرے کاندھوں پر پھیلی ہوئی تھیں۔

ایک ہزارویں رات، بارہ بجے کا وقت۔

''پرانے بادشاہوں کا کیا ہوا؟ یزدگرد اور کسریٰ؟ اور دربار کے فریادی؟''

میں نے قہرامانہ سے پوچھا۔

قہرامانہ نے سر ہلایا۔ یہ اسکی ہزارویں رات تھی اس نے کوئی کہانی نہیں سنائی۔

''کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے کوئی انّا گونگی ہو؟'' میں نے مذاقاً اپنی بند کھڑکیوں سے پوچھا۔ یہ بات ہم نے اپنے والد سے چھپائی کہ وہ گونگی تھی۔ مجھے اس کا ساتھ اچھا لگتا تھا جبکہ ابا چاہتے تھے کہ میں سو جاؤں۔

ایک ہزارویں ایک رات، بارہ بجے کا وقت۔

''پہلی دستک، دوسری دستک، تیسری دستک '' وہ گن رہی تھی۔ آج پہلی بار قہرامانہ بولی تھی۔ دیوار پر دستک کی آواز ہمیشہ سے تھی، جس آواز کو ہم نے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی، یہ آواز اس کے چہرے پر خوف بن کر چھا گئی۔ اس نے منہ بنا کر آواز سننے کی کوشش کی۔ تیسری دستک، دوسری دستک، پہلی دستک......... اسنے میری چوٹیاں کھول دیں اور بال پھیلا دیئے اور تھوڑی دیر تک انھیں دیکھتی رہی۔ پھر اسنے میرے والد کی چھڑی سے مشابہ اپنی لمبی انگلیوں سے میرے بالوں کی لٹیں اٹھا کر پہلی چوٹی گوندھنا شروع کی۔ اس نے پہلی لٹ اٹھائی تو اس میں سے انگوٹھے برابر ایک جن نمودار ہوا جس کو اس نے دوسری لٹ اٹھا کر چوٹی میں گوندھ دیا اور جن کا راستہ بند کر دیا۔

جن نے جھک کر کہا'' میں آپ کا غلام ہوں، حکم کا منتظر ہوں۔''

'' کیا تم مجھے ہرن کی طرح کودنا سکھا سکتے ہو؟'' ایک آدمی نے پوچھا جو اچانک قہرامانہ کی انگلیوں کے درمیان نمودار ہوا تھا۔ وہ ہمارے گھر کا طبیب تھا۔ اسکی شہرت اور اس کی جادو کی تلوار کی شہرت اس سے پہلے پہنچتی تھی۔ اس نے کئی دشوار گذار، پتھریلی راہوں کا سفر کیا تھا، علم کے سات سمندر اس کے تابع تھے۔ اسکا کل سرمایہ بس ایک تلوار تھی۔ وہ دشوار سفروں سے تھک گیا تھا اور اس کی شہرت ہم لوگوں تک پہنچ چکی تھی۔ میرے والد جلد کے چھالوں کی تکلیف سے پریشان تھے جن سے خون بھی رسنے لگا تھا۔ والد کو اس کو بلانا چاہتے تھے سو وہ اپنی مشہور تلوار کے ساتھ آ گیا۔ اس نے ماچس کی تیلی جلا کر اپنی تلوار کی دھار پر سب کو چیونٹی کی طرح چلتا ہوا ایک جن دکھایا جو والد کی ہڈیوں میں داخل ہونا چاہتا تھا۔ سب لوگ جو یہ دیکھ رہے تھے انھوں نے بھی کھجانا شروع کر دیا۔ جب اس علاج کا عمل ہو رہا تھا میں وہاں موجود نہیں تھی۔ میرے والد کو تنہائی میں لے جا کر تلوار کی مدد سے جن سے جدا کیا گیا۔ تلوار گرم کی گئی یہاں تک کہ وہ سرخ ہو گئی پھر اسے چھالوں پر رکھکر دبایا۔ کمرہ دھوئیں کے بادل اور انسانی گوشت کی چراند سے بھر گیا۔ میرے والد

اپنے جسم پر جلنے کے داغ لئے پھرتے رہے. گھر کے ملازمین سرگوشیاں کرر ہے تھے کہ میرے والد اس علاج کے دوران مرنے سے کیسے بچ گئے، بہر حال وہ زندہ تھے۔قہرامانہ کہہ رہی تھی۔

میرے والد نے طبیب کوانعام کے طور پر اپنے ذاتی حلقے میں شامل کرلیا۔ میرے والد کے سارے آدمی ایک قسم کے لوہے کے جوتے پہنے رہتے تھے۔ طبیب کے ننگے پاؤں چپٹے اور سیدھے تھے۔ اسکے پیر درخت کے پاس مٹی کی ڈھیریوں جیسے لگتے تھے۔ مجھے اور نوکروں کو وہ پیر بہت اچھے لگتے تھے۔ طبیب نے بخوشی لوہے کے جوتے پہن لئے اور میرے والد کے حلقے میں شامل ہوگیا۔ اب وہ مور کی طرح اکڑ اکڑ کر چلنے لگا اور اسکی تلوار دوسرے لوگ لے کر چلنے لگے۔ جب اس کی ٹانگیں اور جسم سیمنٹ کی طرح جم کر اسکی گردن سے بس جڑے رہ گئے تو میرے والد نے اسے اٹھانے کے لئے لوگ مقرر کردئے۔ وہ میرے والد سے بہت محبت کرتا تھا، اتنی محبت کہ اس نے مور کی طرح اکڑ اکڑ کر چلنا بھی چھوڑ دیا۔ نوکر باتیں کرتے ''یہ ان سات سمندوروں کا انتقام ہے جنھیں یہ چھوڑ آیا ہے۔''

''کیا تم مجھے ہرن کی طرح کودنا سکھا سکتے ہو؟'' طبیب چلایا۔ ننھے سے جن نے ایک ہرن لانے کا وعدہ کرلیا۔ قہرامانہ میری آدھی چوٹی بھی گوندھ چکی تھی مگر ہرن نہ ملا۔ ہرن کے بجائے جنِ نے ہمیں ایک خفیہ دروازہ دکھایا، وہ دروازہ جس کا علم میرے والد کو بھی نہیں تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار میرے والد نے بھاگ جانے کا ارادہ کیا تھا۔ مگر پھر انھیں ایک تعویز مل گیا اور وہ چین سے ہوگئے اور اس قسم کی دیوانگی سے چھٹکارا پالیا اور وہ دروازہ بند ہی رہا۔ میرے والد کے گرد لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، اور انھوں نے طے کرلیا پھر کبھی ایسی دیوانگی نہیں ہوگی۔ اب وہ چھوٹا سا جن ایک عمل بتانے پر تیار ہوگیا۔

''جب سات بار سورج نکل چکے، تب دورازے کی طرف منہ کرکے کھڑے ہوجاؤ، بس دروازے کی طرف، پھر خود اپنے ہاتھ سے، پوری قوتِ ارادی سے لوہے کی ٹانگیں کاٹ دو اور بھاگنا شروع کردو۔ اگر تم میں ہمت ہے تو ہرن کی

ٹانگیں تمھیں لے چلیں گی اور تم آزاد ہو جاؤ گے۔"

"اور اگر میری قوت ارادی اتنی مضبوط نہ ہوئی تو ؟" طبیب چلایا۔"میں اپنے جوتوں کے بغیر نہیں جانا چاہتا۔ اگر میں انھیں نہیں پہنوں گا تو سردی سے میرے پاؤں ٹھٹھر جائیں گے۔"

پھر وہ جن دھول بن کر میری پہلی چمک دار چوٹی میں غائب ہو گیا۔

ایک ہزار تیسری رات، بارہ بجے کا وقت۔

ایک دستک........دوسری دستک۔

میری قہر امانہ نے میرے بالوں کی تیسری لٹ اٹھا کر گوندھی اور عین بارہ بجے ایک فوارے کی پھوار ہوا میں بکھر گئی۔ ہلکے سے قہر امانہ کی انگلیوں نے میرے بال اندرونی صحن اور فوارے کے اطراف کے جنگلے کی سلاخوں سے لپیٹنے شروع کر دئے۔ فوارے کا پانی اچھل کر میری چوٹی اور والد کے آدمیوں کے چہرے کی دراڑوں پر گرنے لگا۔ انھیں پیاس نہیں تھی۔ نوکر چاکر ان لوگوں اور فوارے گرد گھومنے لگے۔ میری خادمہ چاندی کے ہاتھوں کے ساتھ پکڑی گئی۔ فوارے پر چاند کا عکس پڑ رہا تھا اور وہ اسے چھونے کے لئے سلاخوں کے بیچ سے ہاتھ بڑھا رہی تھی۔ مجھے اس پر رشک آ رہا تھا۔ انھوں نے اسے کوڑے مارے اور اسکے بازو فوارے میں پھینک دئے گئے۔ رمضان، میرے والد کے خاص مشیر نے فوارے کو توڑ دینے کا حکم دیا۔ انھوں نے ہزاروں کنکریاں اس میں بھروا دیں مگر اس میں سے پانی رِستہ ہی رہا۔ جب وہ کنکریاں بھر چکے تب پھر سے فوارہ کی پھوار فضا میں آہستہ آہستہ بلند ہونے لگی۔

رمضان نے جس کی آستین میں ہزاروں چالیں چھپی ہوتی تھیں کہا "شیشے کا زنداں آہستہ آہستہ کمزور ہوتا جا رہا ہے" اس لئے اس نے سلاخوں والے جنگلے پر بھی شیشے کا غلاف چڑھا دیا۔

یہ ایک ہزار ساٹھویں رات تھی اور چاند چمک رہا تھا، قہرامانہ کے چہرے پر ایک بار پھر عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ ہر طرف دیواروں پر دستکیں ہو رہی تھیں۔ جب اس نے میرے بال چوٹی گوندھنے کے لئے تین حصوں میں تقسیم کئے تو میرے ہاتھ کانپنے لگے۔

"باہر ایک مرد ہے، دستک دے رہا ہے، دستک دینے والا مرد حکمرانی کرنا چاہتا ہے۔ میری پیاری! تم ڈر کیوں رہی ہو" قہرامانہ کی انگلیاں میرے کانپتے کندھوں تک آئیں۔

"لیکن اس گھر میں تو بس میرے والد حاکم ہیں؟"

اس نے پھر عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ میں پوری جان سے کانپ رہی تھی۔ بند تالوں کو پار کر کے دستکوں کی آواز آ رہی تھی۔ قہرآمانہ کی آواز صاف آ رہی تھی، وہ مجھے چڑیوں کی بولیوں کے بارے میں بتا رہی تھی اور میری انگلیاں ایک لٹ کو سہلا رہی تھیں جس میں ایک مور گندھ گیا تھا۔

"اے خوبصورت لڑکی! میں نے سنا ہے کہ ہوا ایک مور کو تمہارے والد کے گھر لے آئی تھی۔ مور اور مورنی ساری رات ایک درخت پر بیٹھے رہے کیونکہ وہ ایک دیو سے خوفزدہ تھے۔ ہر صبح وہ چھپ کر کھانے کی تلاش میں نکلتے تھے یہاں تک کی ہوا ان کے پاس ایک بطخ، گدھا اور ایک اعلیٰ گھوڑا لے آئی۔ یہ سب ایک خواب کا تذکرہ کرتے تھے۔ انسان کے خطرے سے خبردار کر دینے والا خواب۔ یہاں وہ سب خوفزدہ تھے اور کچھ نہیں کر پا رہے تھے تب وہ پیلے شیر کے بچے کے پاس گئے جو قریب کی پہاڑی کے ایک غار میں رہتا تھا۔ جب شیر کے بچے نے انھیں اتنا ڈرا ہوا دیکھا تو ان کو مار ڈالنے کا تہیہ کر لیا۔"

وہ میری لٹیں بل دے کر چوٹی میں کچھ یوں گوندھ رہی تھی جیسے ہمارے گھر کی دیوار اٹھا رہی ہو۔

ایک دستک.....دوسری دستک.....دس.....

اب دستک میری چوٹی میں سے آ رہی تھی۔ میں نے خیالی دروازہ کھولا۔ میرے دبلے پتلے والد بڑھئی کے اوزار لائے اور ایک پنجرہ بنا دیا۔ سب سے پہلے شیر کا بچہ پنجرے میں داخل ہوا۔ میرے والد نے اسے جلا دیا۔ دوسرے جانور بھی پنجرے میں

داخل ہوگئے۔ میں بھی مور کے پر لگائے اس میں داخل ہوگئی۔ میں کنارے پر ہی تھی، میرے والد بھی اندر آگئے اور پنجرے کا دروازہ بند کرلیا۔ میرے پر انکے جسم سے مس ہورہے تھے۔ میں نے ان کے گھنے بال چھوئے۔ یکا یک وہ ہم سب کے گرد اچھلنے کودنے لگے، ان کی پیٹھ کے لال داغ نمایاں تھے اور ہم تالیاں بجارہے تھے۔ میرے والد ان لال داغوں سے تھک چکے تھے اور مشہور بزرگ نے انکو مور کے پر پہننے کا مشورہ دیا۔ لوگ ایک مور لائے اس کو ذبح کیا اور میرے والد نے اس کے پر پہن لئے۔

قہرامانہ نے اپنی انگلیاں چوٹی گوندھنے کے لئے بڑھائیں، میں نے ان سے التجا کی کہ وہ میری ایک بالوں کی ایک شریرلٹ چوٹی میں نہ گوندھیں۔ معزز گھرانوں کی بیٹیوں کے دل کالے ہوتے ہیں اور قہرامانہ نے میرے کان کھینچے۔ میں نے اپنا دل کھنگالا اور ایک کالا دھبہ اس سے بہہ نکلا۔ میں نے سوچا، میں چڑیا کا انتقام لینا چاہتی ہوں۔

اور پھر وہ ایک ہزار سوویں رات تھی۔

سب دیواروں سے، ہر چیز سے، یہاں تک کہ میرے والد کے چہرے سے دستکوں کی آواز آرہی تھی۔

''کیا یہ سچ ہے کہ ایک مالک باہر ہے جو اندر آنے پر بضد ہے؟''

میری قہرامانہ نے غصے سے میری سوویں چوٹی گوندھی اور میری انگلیوں کو اسے چھونے بھی نہیں دیا۔

''معزز گھرانوں کی لڑکیاں اپنی چوٹیاں گندھواتی ہیں اور کہانی سنتے سنتے سو جاتی ہیں.....''

مجھے بے خوابی کی شکایت تھی۔ نہ تو کہانیاں سے اور نہ ہی میرے باپ کا خوف مجھے سلانے میں کامیاب ہو پاتا تھا۔

''باہر والا آدمی دیکھنے میں کیسا ہے؟''

قہرامانہ نے جواب نہیں دیا۔ جب وہ میری چوٹی گوندھ رہی تھی تو میں نے

بند کھڑکی کی چوکھٹ پر جمی ہوئی ذراسی دھول اٹھا کر ہاتھ میں لے لی اور باہر والے آدمی کی شکل کو تصور کیا اور اپنے ہاتھ پر پھونک ماری۔ جب قہرامانہ چھوٹی گوندھ رہی تھی تو میں نے چپکے سے اس باہر والے آدمی کو اپنی چوٹی کی ایک لٹ میں چھپا دیا۔ قہرامانہ کی آنکھیں چمکیں اور مجھے ایسا لگا جیسے بجلی مجھ پر گری۔ قہرامانہ نے میرے بالوں کی لٹوں کے ڈھیر میں اس باہر والے آدمی کو دبا دیا۔ جب وہ چوٹی گوندھ رہی تھی تو میرے والد اور سپاہیوں کی موجودگی میں جنگی مشاورت کی مجلس بلائی گئی۔

''کون سے دشمن؟ یہاں تو کوئی دشمن نہیں ہے'' میں نے قہرامانہ سے کہا مگر اس نے مجھے خاموش رہنے کو کہا۔

منصوبے پر عمل ہوا، بڑے بڑے مرتبان آئے اور خانہ بدوش بلائے گئے۔ مرتبان کھولے گئے اور فوج باہر آئی۔ فوج میں جو لوگ تھے ان کی ٹانگیں کٹی ہوئی تھیں۔ رمضان بولی لگا رہا تھا اور میرے والد نقد ادا کر رہے تھے۔ وہ چل نہیں سکتے تھے تو وہ ایک ڈھیر کی شکل میں جمع ہو گئے اور خانہ بدوشوں کے احکامات بجالانے لگے۔ میرے والد نے انھیں تہہ خانے میں رکھنے کا حکم دیا۔

''دیکھو نا! کوئی جنگ نہیں ہو رہی ہے قہرامانہ۔ دنیا میں ہمارے گھر کے علاوہ کوئی حکومت نہیں ہے۔''

ایک سپاہی کے ہاتھ سے ایک گھڑا گر گیا جو اس نے اپنے کپڑوں میں چھپا رکھا تھا۔ میرے والد نے اسے کھولنے کا حکم دیا۔ ایک مکمل بچہ اس میں گھٹنیوں چلتا ہوا نکلا۔ بچے کی نیلامی کافی دیر چلی اور میرے والد نے آخری بولی لگائی۔ انھوں نے حکم دیا کہ اسے بند دروازے کے سامنے ایستادہ کر دیا جائے۔

''جیت کا نشان'' انھوں نے کہا۔

اسکے قدموں کے پاس لکھ کر لگا دیا گیا۔ ''جیت کا نشان'' ۔ نو ماہ بعد اس کے رونے کی آواز، گھر کی فضا کو چیرتی ہوئی پتھروں کے ریشوں میں جذب ہو گئی اور میری سوویں چوٹی میں بھی داخل ہو گئی۔ اسکی چیخوں کی ریت سے میری چوٹی پھول گئی تھی۔

اکیس ہزارویں رات۔
''آج تم دلہن ہو''
میں دلہن بنی تھی اور سب آنکھیں میرا تعاقب کر رہی تھیں۔ رمضان میری چوٹیوں کی پیمائش کر رہا تھا۔ ہر چیز بڑھتی اور پھولتی جا رہی تھی، سڑکیں، دیواریں، اور ہر وہ چیز جس پر میری نگاہیں پڑتی تھیں۔ یہ شادی تھی اور قہرامانہ کے ہاتھ سے فوارے کا رنگین پانی ٹپک رہا تھا۔ اسکے پاس یہ کہاں سے آگیا؟ مجھے نہیں معلوم۔ اس نے میرا منہ دھویا، میری ساری چوٹیاں اکٹھا کر کے ایک بڑی چوٹی میں باندھ دیں اور اس میں ایک لڑکی کو لپیٹ دیا۔

مجھے بتایا گیا کہ جس رات مالک نے نیند سے جاگ کر ایک بیٹی کی مانگ کی تھی تو وہ ایک بچی بدوؤں کے خیمے سے لائے تھے اور جس رات رمضان نے جاگنے کے بعد ایک بیوی کی مانگ کی تو اس لڑکی کی شادی کر دی گئی۔

اچانک میں خوشبوؤں میں بسی ہوئی ایک اجنبی خواب گاہ میں موجود تھی۔ میں خوفزدہ تھی، یہ شبِ عروسی تھی۔ میری چوٹی رمضان کی گردن کے گرد تنگ ہو رہی تھی۔ وہ مر رہا تھا۔ وہ جو میرے والد کا دستِ راست تھا۔ یہ شادی تھی، اور میری چوٹی نے رمضان کو مار ڈالا۔

سب راہیں بند ہو گئیں تھیں۔ میں نے دوڑنا شروع کر دیا۔ اندرونی صحن سلاخوں سے گھرا ہوا تھا۔ جیسے ہی میں نے انھیں چھوا ایک دھماکے کی آواز آئی۔ مجھے یاد آیا کہ قہرامانہ نے میری ایک لٹ کھلی چھوڑ دی تھی۔

''کچھ ایسے بھی لوگ ہیں جو کہانیوں کی گرفت میں نہیں آتے''میں نے سرگوشی کی۔

میں اپنی پیشانی دیکھنا چاہتی تھی۔ دھماکے کی وجہ سے فوارے سے تیزی سے پانی نکل رہا تھا، میں نے پانی میں اپنا چہرہ دیکھا۔ میں نے پانی میں قہرامانہ کا چہرہ اور اپنی بڑی سی چوٹی دیکھی۔ وہ تکلیف سے بے حال تھی اور ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔ گھر کے سب لوگ فوارے سے ابھرتی بل دار چوٹی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سب کے دیکھتے دیکھتے قہرامانہ پتھر میں تبدیل ہو گئی۔ اور میں آزاد ہو گئی، بتدریج فضا میں بلند ہوتی چلی جا رہی تھی۔

☆☆☆